

# مرضاہ بین قاضی حسین احمد



**PDFBOOKSFREE.PK**

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مضامین

قاضی

حسین احمد

# مضامینِ قاضی حسین احمد

قاضی حسین احمد



باذوق لوگوں کے لیے  
ہماری کتابیں  
خوبصورت کتابیں  
ترتیب و اہتمام اشاعت

خالد شریف

All rights of Text & Layout reserved.

No part of this book may be produced without  
permission otherwise legal proceeding shall be  
initiated.



### ضابطہ

بار اول	:	۲۰۰۶ء
کمپوزنگ	:	ماورا کمپوزنگ
ناشر	:	ماورا پبلشرز، لاہور
طابع	:	شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت	:	280/- روپے

خوبصورت کتب کی اشاعت کیلئے رابطہ

**MAVRA BOOKS**

60-The Mall, Lahore.

Ph: 6303390 - 6304063

Mob: 0300-4020955

0333-4224788

E-mail-mavrabooks@yahoo.com



# انتساب

اُمّتِ مسلمہ کے نام—!

کاش ہم دین کے راستے پر چلتے ہوئے  
اپنی عظمتِ رفتہ کی بازیافت کر سکیں

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے  
وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارا  
(اقبال)

قاضی حسین احمد



## فہرست

☆ ایک مربی ابو کو ایک کارکن بیٹی کا خراجِ سمیجہ راجیل قاضی ' ۹

### مضامین

- ۱- بقی کا دورہ جنوبی ایشیا بھارت، پاکستان، افغانستان ' ۱۵
- ۲- تحفظ ناموس رسالت..... وقت کا تقاضا ' ۲۰
- ۳- نام نہاد اعتماد سازی ' ۳۲
- ۴- دہشت گردی کے الزام اور اُمت مسلمہ - ۱ ' ۳۶
- ۵- دہشت گردی کے الزام اور اُمت مسلمہ - ۱۱ ' ۴۵
- ۶- فوجی حکومت اور عوام کے جمہوری حقوق ' ۴۹
- ۷- اجتماع عام کا پیغام ' ۶۶
- ۸- ملکی صورت حال — مسئلے کا حل ' ۷۱
- ۹- پاکستان کو درپیش حقیقی خطرات ' ۸۳
- ۱۰- عالم اسلام اور امریکہ - مفاہمت کی تلاش ' ۹۴
- ۱۱- ملت کا حدی خواں ' ۹۹
- ۱۲- قومی انتخابات ۲۰۰۲ء ' ۱۱۰

## مضامین قاضی حسین احمد ————— ۸

- ۱۳- بحرانی دور میں راہِ عمل ' ۱۲۰
- ۱۴- تعلیم و تربیت اور جہاد کا وسیع تصور ' ۱۳۳
- ۱۵- قومی بیداری - وقت کا تقاضا ' ۱۴۱
- ۱۶- دورہ امریکہ - مقاصد افادیت اور خدشات ' ۱۵۶
- ۱۷- دورہ جاپان و چین - مشاہدات و امکانات ' ۱۶۸
- ۱۸- تحریک اسلامی اور عالمی تناظر ' ۱۸۰
- ۱۹- ہدایات ' ۱۹۲
- ۲۰- آئیے حالات درست کریں ' ۲۱۸
- ۲۱- اسلامی تحریکیں - خدشات اور امکانات ' ۲۳۱
- ۲۲- سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ' ۲۴۱
- ۲۳- پاکستان کی دہلیز پر انقلاب کی دستک ' ۲۵۸

## ایک مربی ابو کو ایک کارکن بیٹی کا خراج

انسان کی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے والدین سے محبت کرتا ہے۔ اُن جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے اُسے ایسے والدین نصیب ہو جائیں جنہوں نے اس انسانی دنیا میں کچھ لوگوں پر اپنے کردار کے نقش ثبت کیے ہوں تو اُن کی اولاد کے لیے تربیت کے مواقع زیادہ میسر آ جاتے ہیں۔ مجھے بھی اللہ نے اپنے خاص فضل و احسان سے ایسے والدین عطا کیے جن کی بے پناہ محبت و شفقت اور محنت و تربیت سے آج میں اور میرا خاندان دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے پشتیبان خادم اور کارکن کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اس پہچان پر ہم اللہ کے شکر گزار اور اپنے شفیق ابو کے ممنون احسان ہیں۔

بچپن سے ہی اپنے ابو کو اسلامی تحریک سے وابستہ اور اُن کی خدمت کے لیے کمر بستہ دیکھا اور اُن کی اُجلی بے داغ زندگی کے وہ گوشے میرے سامنے ہیں جن سے باہر کی دنیا نا آشنا ہے مگر ہمارے ہاں کے ایک خاص مزاج کی وجہ سے آج تک اُن چھپے گوشوں کو بے نقاب کرنا چونکہ شخصیت پرستی کے زمرے میں شمار ہو سکتا تھا اور قلم بھی جب ایک صلیبی بیٹی کا ہو تو معاملات اور زیادہ نازک ہو جانے کا خدشہ تھا۔ اس لیے خاموشی ہی مناسب تھی مگر قلم کے اس روزے کو اس طرح توڑا گیا کہ مجھے لاہور کینٹ میں ایک گھر میں درس قرآن کے لیے دعوت دی گئی۔ درس دینے پہنچی تو خاتون خانہ بالکل میری چھوٹی بہن کی ہم شکل تھیں اور پہلی ملاقات میں ہی شناسائی دوستی میں بدل گئی اور پتہ چلا کہ یہ تو لاہور کا ایک بہت



مشہور ادبی گھرانہ ہے اور ان کے میاں ایک مشہور ناشر ہیں۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے مجھ سے تقاضا کیا کہ ہم اپنے ادارے کے تحت قاضی صاحب کے مضامین چھاپنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں اُن کی تحریریں دے دیں۔ میری دلی مراد برآئی۔ میں کافی عرصہ سے ابو کی تحریریں جمع کرتی رہی تھی۔ ابو کی بڑی پیاری عادت ہے کہ وہ ہمارے ساتھ بیٹھے بیٹھے کاغذ کے ٹکڑوں پر اپنی روزمرہ کی تقاریر کو بھی نکات بنا بنا کر لکھتے رہتے ہیں اور پھر میں اُن پرزوں کو اُن کی فائلوں، درازوں اور گھر کی مختلف جگہوں سے اکٹھا کر کے سنبھال لیتی۔ میں ابو کو ہمیشہ کہتی کہ آپ تھوڑا سا وقت نکال کر اپنی یادداشتیں مجھے لکھوادیں۔ انہوں نے کئی لوگوں کو مختلف مواقع پر یہ یادداشتیں لکھوائیں مگر ان کی تحریروں کو کبھی بھی کسی مجموعے کی شکل نہ دی گئی اور جب میں نے اس کتاب کے لیے تھوڑی سی کوشش کی تو برادر مرشد احمد نے جو جماعت اسلامی کے دفاتر میں شعبہ تنظیم کے نگران ہیں نے میری بڑی مدد کی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ابو کی اتنی زیادہ تحریریں ہیں کہ کئی کتابیں بن سکتی ہیں مگر آج تک کسی نے بھی اس طرف دھیان نہ دیا۔ حالانکہ یہ تحریک اسلامی کی ضرورت بھی ہیں اور امانت بھی۔

میں نے یہ سارا کام جمع کیا اور محترم خالد شریف صاحب نے اس کی پہلی ذمہ داری قبول کی ہے اور انشاء اللہ اگر ان تحریروں کے جمع کرنے کا کوئی فائدہ کسی کو بھی محسوس ہوا تو اُن کی مزید تحریروں کو بھی جنہیں میں نے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کر لیا ہوا ہے، انشاء اللہ جلد منظر عام پر لایا جائے گا۔ میں محترم پروفیسر خورشید احمد کی خصوصی طور پر شکر گزار ہوں جن سے میں نے تحریری اجازت لی تھی کہ ترجمان میں چھپانے والے مضامین کو کتابی شکل دی جاسکے۔ محترم بھائی خالد شریف صاحب نے مجھے کہا کہ اس کا پیش لفظ آپ خود ہی لکھیں۔ میں نے کہا کہ یہ میرے لیے بڑا اعزاز ہے کہ اُن کی صلیبی بیٹی ان کی کارکن بیٹی کی حیثیت سے اس کتاب کا تعارف پیش کرے اور اُس میں اپنے اُس باپ کا تھوڑا سا تذکرہ کرے



۱۱ ————— مضامین قاضی حسین احمد

جس کے بارے میں حسن نثار کا یہ جملہ مجھے بہت ان پر صادق اور چسپاں نظر آتا ہے کہ مجھے قاضی صاحب یوں لگتے ہیں کہ جیسے ایک باپ اپنی بے امان اولاد کو تحفظ دینے کے لیے ہر جنگ لڑنے پر آمادہ ہو۔

میں نے اپنے ابو کو ایک Complex free انسان کے طور پر دیکھا ہے کہ جو اپنے آپ کو جھونپڑی میں ایک خاک نشین سے برتر نہیں سمجھتا اور قصر میں اور محل میں بیٹھے ایک بادشاہ اور جابر سے مرعوب ہو کر اپنے آپ کو کسی بھی لحاظ سے کم تر نہیں سمجھتا۔ جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں۔ جس کی ساری زندگی ہمارے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ جس کا ظاہر و باطن ایک ہے اور جس کو اپنی زندگی کے کسی بھی گوشے کو کسی طور چھپانے کی کبھی بھی اللہ نے ضرورت محسوس نہیں ہونے دی ہے۔

اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار سپاہی کی طرح اپنی نقد جاں کا سودا کرنے والوں کی صف میں کھڑے ہونے کا احساس ہمیشہ انہوں نے خود بھی حرز جاں بنائے رکھا ہے اور انہوں نے بڑی محنت و مشقت سے اس احساس جاں فزا کو اپنے پورے خاندان کے لیے شعوری طور پر پسند کیا ہے۔ اس پر میرے پیارے ابو کو بہت باتیں بھی سننی پڑتی ہیں کہ انہوں نے جماعت میں شاید وراثت اور موروثی سیاست کی بنیاد رکھی ہے۔ مگر میں آج یہ حقیقت واضح کرنا چاہتی ہوں کہ انہوں نے شعوری طور پر وہ راہ ہمارے لیے پسند کی ہے جسے انہوں نے اپنے لیے منتخب کیا۔ وہ یہ بات ہمیشہ کہتے ہیں کہ جو دعوت میں ساری دنیا کو دیتا ہوں اُس سے میں اپنے خاندان کو کیوں محروم کروں اور یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے کہ انہوں نے اپنے گھر اور اپنے خاندان سے دعوت اسلامی کی ابتداء کی۔ ہمیں بھی ہمارے والدین نے اس پورے عرصے کے دوران اپنے ساتھ ساتھ رکھا اور اس کے گرم و سرد ادوار میں ہم اور ہمارا پورا خاندان ابو

کی پشت پر رہے۔ اور آج الحمد للہ سب تحریک اسلامی کے دست و بازو بن کر اُس کی ہر خدمت کے لیے میدانِ عمل میں کھڑے ہیں۔ بچپن سے ہی مجھے ان کی تقریروں کا ایک جملہ یاد ہے جو اپنے الفاظ اور اپنے معانی دونوں میں یاد رکھنے اور بار بار دہرائے جانے کے قابل ہے اور جس پر انہوں نے اپنی زندگی اور ہماری زندگی کی بناء رکھی ہے کہ وہ یہ ہے کسریٰ کے دربار میں ایک صحابی سے پوچھا گیا کہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشور کیا ہے۔ وہ کیا بات کہتے ہیں اور کیا دعوت لے کر آئے ہیں۔ صحابی نے بڑا پیارا جواب دیا۔ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے اس دنیا میں آئے تاکہ اخراج العباد من عبادة العباد الى عبادة رب العباد۔ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر انسانوں کے پروردگار کی غلامی میں دینے کے لیے آئے ہیں۔

میرے ابو قرآن کریم کی تلاوت احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور اُس پر غور و فکر سے گھر کے در و دیوار کو اور اُس کے مکینوں کو روشناس کرانے کی ہمہ وقت جستجو میں رہتے ہیں۔ اقبالیات میں تو ہمارا گھر اور گھر کا بچہ بچہ ماہر ہو چکا ہے۔ اتنی کثرت سے اقبال کی لمبی لمبی نظمیں دہراتے رہتے ہیں کہ ہمیں وہ سب یاد ہو گئی ہیں۔ ان کی زبانوں سے محبت نے عربی، فارسی، انگلش، اردو اور پنجابی کا ماہر بنا دیا ہے اور پشتو مادری زبان ہونے کے ناطے گھر میں بولی جاتی ہے۔

ایک دن میرا چھوٹا بھائی ڈاکٹر انس فرحان ابو سے کہنے لگا کہ ابو اقبال نے کبھی خود بھی اتنے اشعار اور اس کے مطالب کسی کو ایسے نہ سمجھائے ہوں گے جیسے آپ ہم سب کو سمجھاتے اور بتاتے ہیں۔

بچپن سے اقبال کی بچوں کی نظمیں ہمیں سنا سنا کر جگاتے۔ ”اے نیند کے ماتو اٹھ بیٹھو“ کی دلنواز آواز کے ساتھ بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر فجر کی نماز کے لیے اٹھاتے تو

۱۳ — مضامین قاضی حسین احمد

امی کبھی ناراض بھی ہو جاتیں کہ یہ آپ انہیں جگا رہے ہیں یا سُلا رہے ہیں۔ فجر کی نماز کے لیے اس محبت سے اُٹھاتے کہ فجر کی نماز ہی پیاری ہو گئی اور سب بہت شوق سے فوراً اُٹھ جاتے۔ ہمیں کہتے کہ اقبال اس لیے پسند ہے کہ وہ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو یاد دلا کر کسی اور زمانے کے خواب دکھاتا ہے اور اُمید کا شاعر ہے۔ کشکش کی زندگی گزارنے پر اُبھارنے کا شاعر ہے۔ وہ خوشخبری دیتا ہے کہ

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا

سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

شاہین کے اور عقاب کے جتنے شعر اقبال کے کلام میں موجود ہیں وہ ہمیں سب ازبر کرادیے ہیں کہ اونچے خواب اونچی اڑان کے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں اور مقاصد و اہداف بہت اعلیٰ ہونے چاہئیں۔ تب انسان اچھی زندگی اور آخرت کی دائمی خوشیوں کا مستحق بن سکتا ہے۔

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے

زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

ساری دنیا کے مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کی آرزو اور اُن کی عظمتِ رفتہ کو بازیاب کرانے کی اُمنگ نے اُن کے پاؤں میں ایسا چکر رکھ دیا ہے جو انہیں کسی پل چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ انتہائی متحرک اور بھرپور زندگی جس کے ایک ایک لمحے کو امانت سمجھتے ہوئے وہ بسر کرتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزلِ مسلمان کی

ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

وہ مولانا مودودیؒ کے انتہائی عقیدتمند ہیں۔ ہمارے گھر میں اُن کو مرشد کی حیثیت



حاصل ہے۔ ابو ہمیں اس کا ہر وقت احساس دلاتے رہتے ہیں کہ یہ سب مولانا محترم کی ریاضت کا ثمر ہے کہ انہوں نے دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے لیے (أم الجماعة) کی بنیاد رکھی اور آج جو پودا انہوں نے سیچا تھا اُن کے اخلاص اور جذبوں سے بھرپور محنت و مشقت کی وجہ سے تناور درخت بن کر عالم اسلام کو اپنے ثمر سے فیض پہنچا رہا ہے۔ اسی طرح سے اپنے پیشرو محترم و مکرم میاں طفیل محمد کے ساتھ بھی انہوں نے انتہائی محبت و احترام کا تعلق اُستوار کر رکھا ہے۔ جو اب وہ بھی انتہائی محبت اور سرپرستی کا تعلق اُستوار کیے ہوئے ہیں۔ ان دونوں گھرانوں کو انتہائی عزت و وقار کا مقام دیتے ہیں اور وہ بھی ہم سے اتنے ہی پیار اور احترام سے پیش آتے ہیں۔

اس بات پر اکثر تبہدیدہ ہو جاتے ہیں کہ اسلامی تحریکوں کے قافلے کے اس سفر میں میثنا خطو! ہم بھی کچھ قدم چلے ہیں اور اگر اللہ اس تھوڑی سی پونجی کو قبول کر لے تو اُس کا بڑا احسان ہوگا۔

میں اپنے مہربان رب سے ان کے لیے دعا گو ہوں کہ

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا (سورہ بنی اسرائیل)

اور یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ میں اپنے ابو کا ذکر کروں اور مادر مہربان کو بھول جاؤں جن کی پشتیبانی کی وجہ سے آج ابو اور ہم سب اس قابل ہوئے ہیں اور ان تحریروں کے اکٹھا کرنے میں مجھے ان کا بھرپور تعاون اور حوصلہ افزائی ملتی رہی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب سے راضی ہو جائے اور اپنے دین کے خادموں کی حیثیت سے ہم سب کو اپنی راہ میں سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت سے ہم کنار کر دے۔ آمین۔

سمیعہ راجیل قاضی

کارکن جماعت اسلامی

## بش کا دورہ جنوبی ایشیا بھارت، پاکستان، افغانستان

بش کیا ایجنڈا لے کر پاکستان آئے، کچھ دینے یا لینے۔ ان کے دورے سے پاکستان کو کیا فائدہ یا نقصان ہوگا۔ آج کل پاکستان کے اخبارات تو ہین رسالت کی تحریک کے ساتھ ان سوالات کے گرد تجزیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر بش اپنی شدید مصروفیات میں سے وقت نکال کر پاکستان آئے ہیں تو وہ امریکی مفادات کے لیے اپنے ایجنڈے کے مطابق بات چیت کرنے کے لیے آئے نہ کہ پاکستانی ایجنڈے کے مطابق۔

امریکہ کے جنوبی ایشیا میں جو مفادات ہیں وہ ان کی نگرانی کے لیے بھارت کو قابل اعتماد ملک سمجھتے ہیں اور اس لیے امریکی انتظامیہ نے بھارت کو خطے میں Natural strategic partner قرار دیا ہے یعنی امریکہ کی نظر میں بھارت علاقے میں اس کی فوجی حکمت عملی کا فطری حلیف ہے۔ ظاہر ہے کہ بش کی کوشش ہوگی کہ اپنے دفاعی مصالح کے لیے جس کو اس نے اپنا فطری حلیف قرار دیا ہے اس کی پشت پناہی کرے اور اسے علاقے میں مضبوط پنچے گاڑنے کے لیے سہولتیں فراہم کرے۔ امریکہ چین کے مقابلے میں بھارت کو تیار کرنا چاہتا ہے اور امریکہ کی کوشش ہے کہ بھارت کو چین کے برابر کی طاقت بنا کر چین کے دنیا کی بڑی طاقت بننے کا راستہ روک دے اور اس کے اپنے خطے میں اس کا ہمسر پیدا کرے۔

بھارت کو یہ مقام دلوانے کے لیے وہ پاکستان کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ بھارت کو خطے کی بڑی طاقت تسلیم کر کے اس کے ساتھ مسئلہ کشمیر بھارت کی سہولت اور بھارت کی مرضی کے مطابق حل کر دے امریکہ کی کوشش ہے کہ تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ موجودہ کنٹرول لائن ہی کو بین الاقوامی سرحد کے طور پر دونوں ممالک سے تسلیم کروالے اور مقبوضہ کشمیر کے عوام کو وقتی طور پر معمولی سی داخلی خود مختاری پر ٹر خا کر بھارت کی منشا کو پورا کر دے۔

بھارت نے مقبوضہ کشمیر کو اپنے دستور میں جو خصوصی حیثیت دے رکھی ہے وہ حالات کے سازگار ہونے پر اس کو بھی واپس لینا چاہتا ہے اور اگر آئینی طور پر مقبوضہ کشمیر کے علاقے کو بھارت کا حصہ تسلیم کر لیا جائے تو بھارت اگر وقتی طور پر اسے کسی حد تک داخلی خود مختاری دینے پر آمادہ بھی ہو جائے تو اسے کسی بھی وقت واپس لے سکتا ہے۔ اس لیے امریکہ بھارت کی یہ ترکیب محض ایک سیاسی فریب ہوگا۔

پاکستان پر اس وقت ایک فرد واحد کی حکومت ہے جو پاکستانی فوج کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے کلی اختیارات کا مالک ہے۔ حال ہی میں ۲۶ فروری کی شانِ مصطفیٰ ریلی کو روکنے کے لیے عوام کو باہر نکلنے سے روکنے اور لاہور شہر کو ہر طرف سے بند کرنے کے لیے سویلین حکومت کی درخواست کے بغیر ریجنرز کو استعمال کیا گیا اور لاہور کے کور کمانڈر نے عوام کو مرعوب کرنے کے لیے جو دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا اس سے ثابت ہو گیا کہ ملک میں عملاً فوج کی عملداری ہے۔

صدر بٹش نے اپنے حالیہ بیانات اور انٹرویوز میں پاکستان کے لیے صدر مشرف کے تصورِ جمہوریت کی حمایت کی ہے۔ فوجی کمانڈر انچیف کو جمہوری حکومت کا سربراہ تسلیم کر کے صدر بٹش نے ثابت کیا ہے کہ ان کے پیانے دوہرے ہیں جو وہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں وہ دوسروں کے لیے پسندیدہ ہے۔ پرویز مشرف صاحب انہیں خوش کرنے کے لیے اور



اپنے عرصہ اقتدار کو طول دینے کے لیے جن پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں وہ پاکستان اور پاکستانی عوام کی مصلحت میں نہیں ہیں لیکن ان سے امریکہ کا منشا پورا ہو رہا ہے۔ وزیرستان میں فوجی کارروائی جس میں معصوم قبائلیوں کے علاوہ خود فوجی جوان بھی قتل ہوئے ہیں۔ باجوڑ میں بے گناہ شہریوں کا قتل، ملک میں مدارس اسلامیہ کے خلاف کارروائی، نظام تعلیم کو لادین بنانے کے لیے نصاب میں رد و بدل اور نصاب پر نظر رکھنے کے لیے آغا خان تعلیمی فاؤنڈیشن کا قیام، پاکستان کے نیوکلیر پروگرام کے خلاف سازشیں اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی نظر بندی جبکہ بھارت اور اسرائیل کے نیوکلیر پروگرام کی سرپرستی۔ پاکستان کو مجبور کرنا کہ بھارت کی مرضی کے مطابق مسئلہ کشمیر کو حل کر دے۔ یہ اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت سے دستبردار ہو جائے۔ پاکستان کو افغانستان کی طالبان حکومت کی طرح ایران کی اسلامی حکومت کے خلاف حلیف بنانے کی کوششیں، یہ وہ عزائم اور ایجنڈا ہے جس کے لیے صدر بش پرویز مشرف کو آلہ کار بنانا چاہتے ہیں اور اسی لیے وہ پرویز مشرف کی تو تعریف کرتے ہیں لیکن پاکستانیوں کا ذکر مغرب کے توہین آمیز لفظ (Pakees) پاکیز کہہ کر کیا جاتا ہے۔

پرویز مشرف صاحب خوش ہو رہے ہیں کہ صدر بش کو ان کی وردی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پاکستان میں کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حکومت دینے والا اور چھیننے والا امریکہ ہے اور اگر امریکہ کی پشتیبانی حاصل ہو تو فوجی بھی امریکہ سے سے سرتابی نہیں کرتی اور امریکہ اور فوج مل کر کسی بھی حکومت کے استحکام کی ضمانت ہیں۔ حالانکہ اللہ کے بعد کسی ملک کے عوام ہی یہ طاقت اور یہ حق رکھتے ہیں کہ برسر اقتدار حکمرانوں کی قسمت کا فیصلہ کریں۔

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ہمارے خطے میں امریکی مفادات اور پاکستان کے مفادات مختلف ہیں۔ امریکہ بھارت کو خطے کی بڑی طاقت بنانا چاہتا ہے اس کی خاطر وہ کشمیر کا مسئلہ اس کے حق میں حل کرانا چاہتا ہے۔ امریکہ ہمارے نیوکلیر پروگرام کو اپنی بین

الاقوامی دفاعی حکمت عملی کے خلاف سمجھتا ہے جبکہ بھارت سے نیوکلیر ٹیکنالوجی کے حوالے سے معاہدہ کرنے کے لیے گفت و شنید کر رہا ہے۔ امریکہ ہمارے اسلامی نظریے کا کھلم کھلا مخالف ہے اور ہمیں ایک لادین ریاست بنانے پر تلا ہوا ہے جس کے بعد پاکستان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے اور یہاں علاقائی تعصبات اُبھارنے والوں اور مختلف قومیتوں کا پرچار کرنے والوں کو تقویت ملتی ہے جس سے ملک کے حصے بخرے ہونے کا راستہ کھلتا ہے۔ امریکہ پاکستان سے عالم اسلام کے ایک اہم طاقتور ملک کی حیثیت چھین کر اسے جنوبی ایشیا میں بھارت کا ایک طفیلی ملک بنانا چاہتا ہے۔ اگر بھارت اس کی دفاعی حکمت عملی میں اس کا فطری حلیف ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے عالمی نقشے میں پاکستان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے امریکہ کے دانشوروں کی مجلس (Think tank) نے 2015ء تک پاکستان کو دنیا کے نقشے سے باہر کرنے کی کھلم کھلا پیش گوئی کی ہے۔ امریکہ کے ایک ممتاز دانشور اسٹیفن کوہن؟ جو امریکی دانشوروں کے ایک تھنک ٹینک بروکنگز کے اہم رکن ہیں) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پاکستان کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ امریکی منشا کے مطابق ایک سیکولر ریاست بننا قبول کر لے ورنہ ایک اسلامی نظریاتی ریاست کے طور پر اس کا برقرار رہنا ممکن نہیں ہے۔ ایک پاکستانی صحافی نے کافی مدت پہلے جب نرسمہا راؤ صاحب بھارت کے وزیراعظم تھے مجھے ان کے ساتھ اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے ان کی دو باتوں کا خصوصی ذکر کیا تھا پہلی بات یہ کہ پاکستان کا وجود ایک اسلامی ریاست کے طور پر انہیں اس لیے قبول نہیں ہے کہ اس طرح پاکستان نے بھارت کے پندرہ کروڑ مسلمانوں کو اپنے حلقہ اثر میں لے رکھا ہے۔ پاکستان ایک لادین سیکولر ریاست بن جائے تو ہمیں اس کے وجود پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دوسری بات انہوں نے یہ بتائی کہ کشمیر کو بھارتی آئین کے مطابق بھارت کا حصہ رہتے ہوئے جتنی خود مختاری چاہیے وہ ہم

دینے کے لیے تیار ہیں۔ بھارت کی اسی منشا کو پورا کرنا بش انتظامیہ کے ایجنڈے میں شامل ہے۔

بدقسمتی سے ایسے حساس مرحلے پر جب ہماری داخلی اور خارجہ سلامتی مکمل قومی ہم آہنگی کا تقاضا کر رہی ہے ہماری افواج فردِ واحد کی مصلحتوں کی خاطر اپنی قوم سے نبرد آزما ہیں۔ بلوچستان میں آپریشن ہے۔ قبائلی علاقے میں کارروائی ہے، ملک کے اندر تخریب کاری ہے، مارگٹ کلنگ کے ساتھ ساتھ علماء اور مدارس دینیہ کے خلاف کارروائی ہے۔ ناموسِ مصطفیٰ پر حملوں اور مغربی تہذیب کی یلغار میں حکمران اپنی قوم کے مد مقابل کھڑے ہیں۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے مزید عوامی بیداری اور عوامی تحریک کی ضرورت ہے تاکہ ملک و قوم کے مفادات کے تحفظ کی خاطر قومی یکجہتی کی ایک ایسی حکومت قائم ہو سکے جو ملک و قوم کے سلگتے ہوئے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس کی خاطر ایم ایم اے اے آر ڈی اور علاقائی جماعتوں پر مشتمل حالیہ آل پارٹیز کانفرنسوں کی تجاویز، ایم ایم اے اور اے آر ڈی کے متفقہ فارمولا اور قومی مجلس مشاورت کے فیصلوں کے مطابق عوامی تحریک کے ذریعے آئین کے مطابق ایک عبوری حکومت کی تشکیل کی ضرورت ہے جو اکتوبر ۱۹۹۹ء کی حالت میں دستور کو بحال کر کے ایک خود مختار اور ہر لحاظ سے آزاد الیکشن کمیشن کے تحت آزادانہ انتخابات کی راہ ہموار کر دے۔ فوج اور عوام کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے اور آئین کے مطابق تمام قومی ادارے اپنا اپنا فرض ادا کریں۔ غریب عوام کے مسائل کا حل حکومت کی پہلی ترجیح اور لوٹ کھسوٹ کا نظام ختم کر کے درمیانہ طبقے پر ٹیکوں کے بڑھتے ہوئے بوجھ کو کم کیا جاسکے۔ صدرِ بش کا حالیہ دورہ چونکہ فردِ واحد کی حکومت کو تقویت دینے اور امریکی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے ہے اس لیے قومی مجلس مشاورت نے اسے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ (مارچ ۲۰۰۶ء)



## تحفظِ ناموس رسالت..... وقت کا تقاضا

اللہ رب العالمین کا ارشاد ہے:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ ۱۲۸)

”دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے خود گواہی دی ہے کہ جو چیز انسانی برادری کے لیے تکلیف دہ ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گزرتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس فائدے کے حریص ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مومنین پر شفیق اور رب العالمین کی طرف سے تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء ۱۰۷)

”اے نبی! ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے“

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف ۱۵۸)

”اے نبی! کہہ دیجیے کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص قوم، نسل، علاقے یا کسی خاص زبان والوں کے رہنما نہیں ہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔ گورے ہوں، کالے ہوں، عجمی ہوں، عرب ہوں، افریقہ و امریکہ کے رہنے والے ہوں یا ایشیا و یورپ میں رہتے ہوں، ہندوستانی ہوں یا پاکستانی ہوں، پنجابی ہوں، پختون ہوں، سندھی ہوں، بلوچی ہوں، سرائیکی ہوں، مہاجر ہوں، اردو بولنے والے ہوں یا عربی و انگلش والے ہوں، سب کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ اُتارنے والے اور ان کی بندشیں کھولنے والے ہیں اور تمام انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ مسلمانوں کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ اس نبی کی نصرت کرو، اس کی پشتیبانی کرو اور اس کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ کیونکہ اس کے ساتھ کھڑے ہونے میں ہی تمہاری نجات ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ، أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. (الاعراف ۱۵۷)

”(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہذا جو لوگ

اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بغیر ایمان نہیں ہے اور حضور کی محبت کو تمام محبتوں پر غالب کرنا تمام مسلمانوں کا فرض ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ.

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے لیے اپنے والدین، اولاد اور تمام انسانوں سے محبوب نہ بن جاؤں۔“

ایک اور جگہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کو اپنی جانوں سے بھی پیارے ہیں کیونکہ وہ ہمارے ماں باپ اور اہل و عیال سے زیادہ ہمارے خیر خواہ ہیں اور اپنی برادری اور رشتہ داروں سے زیادہ ہمارا خیال رکھنے والے ہیں۔ ہمارے ماں باپ ہمارے لیے برا پسند کر سکتے ہیں اور ہمیں بُرے راستے پر ڈال سکتے ہیں، ہماری اولاد ہمارے لیے امتحان ہے اور ہمیں غلط راستے پر ڈال سکتی ہے، ہماری برادری ہمارے خلاف سازش کر سکتی ہے لیکن حضور نبی کریمؐ کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ ہر حال میں اپنی اُمت اور تمام انسانوں کے خیر خواہ اور مہربان ہیں اور انسانیت کو سیدھا راستہ دکھانے والے ہیں۔ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے والدین سے بھی زیادہ ہمارے خیر خواہ ہیں تو وہ بھی ہمیں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہونے چاہئیں اور ان کا رشتہ تمام رشتوں سے مقدم ہونا چاہیے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تلقین کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:



قُلْ إِنْ كَانَ آبَاءُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ۖ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ. (التوبة ۲۴)

”اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔“

اللہ اور رسول کی محبت لازم و ملزوم ہیں اور اللہ کی محبت کے حصول کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ إِنْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (ال عمران ۳۱)

”اے نبی! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

مسلمان جب حضور کا نام نامی لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فِدَاہُ اَبِیْ وَ اُمِّی (میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں)۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں حضور کی محبت بٹھادی ہے بلکہ یہ محبت ان کے خمیر میں ایسے شامل کر دی ہے کہ کوئی دوسری محبت اس پر غالب نہیں آ سکتی۔

دنیا کے تمام لوگوں کو یہ بتانے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ یہ ہمارے لیے ادب کی وہ جگہ ہے کہ اس کے اوپر کوئی ٹھیس ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک فارسی شعر ہے:

ادب گاہست زیر آسماں از عرش نازک

نفس گم کردہ می آئند جنید و بایزید ایں جا

”آسمان کے نیچے ادب کی ایک ایسی جگہ ہے کہ عرش سے بھی زیادہ نازک ہے“

جنید اور بایزید جیسے اولیاء اللہ یہاں پر سانس روک کر آتے ہیں۔“

خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے آداب سکھائے

ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا

تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ

وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ. إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ

أُولَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَى لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ

عَظِيمٌ (الحجرات ۲۳)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی

کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے

کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر

بھی نہ ہو۔ جو لوگ رسول خدا کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست

رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے

جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔“

حضور کے ساتھ محبت اور عشق جزو ایمان ہے اور مسلمان اسی شمع محبت کے گرد اکٹھے

ہیں، مغرب اس حقیقت سے باخبر ہے اس لیے وہ ہمارے مرکزِ محبت کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ مغربی اقوام جان بوجھ کر اور ارادی طور پر خاکے اور کارٹون بنا کر ہمارے مرکزِ محبت پر حملہ آور ہیں۔ یہ تکبر اور غرور میں مبتلا ہیں اور مسلمانوں اور ان کے ایمان کا امتحان لینا چاہتی ہیں۔ مغربی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے فحاشی اور بے حیائی پھیلایا اور فیشن، مادی ترقی اور اپنی اشیاء کو ان کی ضرورت بنا کر ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمان ہماری تہذیب و ثقافت کی گرفت میں ہیں اور ہماری تہذیبی یلغار نے ان کے دلوں سے ایمان اور حضور نبی کریم کی محبت کو نکال دیا ہے۔ ہمارا میڈیا ان کے بیڈرومز تک پہنچ گیا ہے۔ ہمارے فحش میگزین اور تصویریں ان کی لائبریریوں اور گھروں میں پڑی ہیں، ہماری سی ڈیز اور ویڈیوز ان کے گلی کوچوں میں گردش کر رہی ہیں۔ ہم نے ان کی ثقافت اور معاشرتی اقدار کو تبدیل کر دیا ہے۔ ان کی عورتیں نیم برہنہ لباس پہنتی ہیں اور میراتھن ریس کے ذریعے ہم نے انہیں مردوں کے ساتھ سڑکوں پر دوڑا دیا ہے۔ اور ان کے اوپر ہم نے ایسے لوگوں کو حکمران بنا دیا ہے جن کے دل ایمان اور حضور کی محبت سے خالی ہیں اور جو اپنی قوم کی تمنائوں اور آرزوؤں سے بے خبر ہیں۔ اس یقین کی بنا پر انہوں نے زمینی حملوں کے ساتھ ساتھ توہین آمیز کارٹونوں اور خاکوں کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں پر یلغار کر دی ہے۔ بیسیوں ممالک کے سیکڑوں اخباروں اور ہزاروں ویب سائٹس پر یہ کارٹون چھپ چکے ہیں اور اٹلی کے ایک وزیر نے کہا ہے کہ میں وہ ٹی شرٹ پہنوں گا جس پر یہ خاکے چھپے ہوئے ہیں۔

مغرب والے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کے لیے آزادی اظہار رائے کا سہارا لیتے ہیں اور یورپین کمیونٹی نے کہا ہے کہ اظہار رائے کی آزادی ہمارا کلچر ہے، ہم اس پر کوئی پابندی نہیں لگائیں گے اور پریس کی آزادی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ حالانکہ انہی مغربی ممالک میں ہولوکاسٹ (Holocaust) کو جھوٹ یا مبالغہ آمیز قرار دینا اور یہ کہنا کہ



جب جرمنی میں ۶۰ لاکھ یہودی تھے ہی نہیں تو وہ قتل کیسے ہو گئے قابل سزا جرم ہے۔ ایران کے صدر احمدی نژاد نے ہولوکاسٹ کو من گھڑت جھوٹ قرار دیا تو مغرب میں واویلا مچ گیا اور ایک ایرانی چینل اور حزب اللہ کے ٹی وی چینل پر پابندی لگا دی گئی اور ابھی پچھلے دنوں ایک یورپی عدالت نے ہولوکاسٹ کو جھوٹ قرار دینے والے مورخ (David iming) کو کئی سال قید کی سزا سنائی ہے۔ یہ دو ہرے معیارات ہیں اور مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلنے کو آزادی اظہار سے تعبیر کر لیا گیا ہے۔ یہ چیز ہمارے لیے ناقابل قبول ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حسن انسانیت ہیں۔ حسن انسانیت کا مذاق اڑانا ان کے کارٹون بنانا اور اس کے نتیجے میں سوارب مسلمانوں اور دنیا کے ہر انصاف پسند انسان کے دل کو زخم لگانا اصل دہشت گردی ہے۔ اس کے خلاف احتجاج ہمارا حق ہے اور دنیا کے ہر انصاف پسند انسان کو اس احتجاج میں شامل ہونا چاہیے۔

امریکہ اور یورپ اظہار رائے کی آزادی پر زور دیتے ہیں لیکن وہاں بھی حقیقی معنوں میں اظہار رائے اور اظہار خیال کی آزادی نہیں ہے۔ میں نے امریکہ و یورپ کا دورہ کیا ہے وہاں پریس کانفرنسیں کی ہیں لیکن جب بات کے چھپنے کی اجازت نہیں ہوتی، کسی اخبار میں اس حوالے سے ایک لفظ بھی نہیں آ سکتا۔ کسی بھی چیز کے چھاپنے کے لیے وہ اوپر کے اشارے کے منتظر ہوتے ہیں۔ ڈنمارک کے جس اخبار نے ان خاکوں کو سب سے پہلے چھاپا، اسی نے عیسائی برادری کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام (جو ہمارے لیے بھی محترم ہیں) کے خاکے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا لیکن مسلمانوں کو گالی دینے اور ان کے جذبات کو مجروح کرنے کی کھلی آزادی ہے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟

دنیا میں سوارب مسلمان بستے ہیں اور دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر ان کی حکومتیں قائم

ہیں۔ ان کے علاقے قدرتی خزانے اور وسائل سے مالا مال ہیں، ساری دنیا کی مشینری اس تیل سے چلتی ہے جو مسلمانوں کی زمین سے پیدا ہوتا ہے، اگر مسلمان مغرب کا مال تجارت خریدنے پر مجبور ہیں تو مغرب کا انحصار بھی مسلمانوں کے خام مال پر ہے۔ سرزمین اسلام میں وہ بہادر اور جفاکش لوگ رہتے ہیں جنہوں نے کئی صدیوں تک انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے اور جنہوں نے بارہ سو سال تک دنیا کے اکثر حصے پر حکومت کی ہے، ۵۷ آزاد ممالک اور او آئی سی کی صورت میں ان کی تنظیم بھی موجود ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود خنجر صرف مسلمانوں پر ہی کیوں چلتا ہے اور صرف انہی کے جذبات ہی کیوں مجروح ہوتے ہیں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک عرصے سے امت کا تصور ختم کرنے کی سازش کی جا رہی ہے اور ہمارے اپنے حکمران کہتے ہیں کہ امہ کہاں ہے؟ استعمار نے ان کو چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں تقسیم کر دیا ہے اور یہ اسی پر خوش ہیں۔ ان کے دلوں اور دماغوں میں امت کا کوئی تصور نہیں ہے، ان سب کو اپنے اپنے گھروندے کی فکر ہے۔ ان نا عاقبت اندیش حکمرانوں کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ اگر الگ الگ رہو گے اور ہمارا ساتھ دو گے تو تمہاری جیب اپنی قوم کے خزانے سے بھری رہے گی اور تم اپنی قوم کا استحصال کر کے اپنی دولت یورپ و امریکہ کے بنکوں میں جمع کراؤ، ہم اس کی ضمانت دیں گے۔ ایک استحصالی گروہ مسلمانوں کے اوپر مسلط کر دیا گیا ہے۔ کہیں آمر ہے، کہیں شیخ ہے، کہیں بادشاہ ہے اور کہیں فوجی حکمران ہے اور امریکہ و یورپ ان سب کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ اسی لیے مسلم حکمران طبقہ تمام معاملات میں امت کے ساتھ کھڑا ہونے کے بجائے امریکہ و مغرب کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے اور آج بھی وہ عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے ظالموں کے صف میں کھڑا ہے۔ ان جیسے لوگوں کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

کل ایک شوریدہ بارگاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا  
 کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں  
 عجب ہیں یہ رہبرانِ خود ہیں خدا تری قوم کے بچائے  
 بگاڑ کے تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں  
 یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے  
 ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آئندہ ہیں  
 سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے  
 نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنارہے ہیں

امتِ واحدہ کے تصور کو ختم کرنے کے لیے اب مرکزِ محبت کو کمزور کرنے کی سازش کی  
 جا رہی ہے۔ مسلمانوں کو جغرافیائی اور لسانی حدود کا پابند بنا دیا گیا ہے اور ان میں قومی  
 تعصب ابھارنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کوئی گُرد ہے، کوئی عرب ہے، کوئی ایرانی ہے،  
 کوئی افغانستانی ہے، کوئی ترک ہے اور کوئی پاکستانی ہے۔ اپنی علاقائی زبانوں اور قومیتوں  
 اور اپنے مسلک اور مکتبِ فکر کو زیادہ محبوب بنا دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس بارے میں  
 فرمایا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے  
 جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے  
 اقوام میں مخلوقِ خدا بٹی ہے اس سے  
 قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے  
 بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے  
 اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویٰ ہے



اور فرمایا:

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

قومیت، زبان اور مسلک کو ثانوی درجہ دینے اور قومیت اسلام اور اللہ رسول اور جہاد کی محبت کو اپنا مرکز محبت بنالینے سے اُمت کا شیرازہ مجتمع ہوگا اور قومیت اسلام زندہ ہوگی۔ حرمت رسول کے تحفظ کے لیے دنیا کے تمام مسلمانوں اور تمام انصاف پسند لوگوں کو اسی طرح متحد اور اکٹھا ہونا پڑے گا جس طرح وہ حرمت قرآن کے مسئلے پر اکٹھے ہوتے تھے اور اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ پرویز مشرف جیسے حکمران ناموس رسالت کا تحفظ کر سکیں گے تو وہ غلطی پر ہے۔ پرویز مشرف نے خاکوں کے چھپنے کے بعد ناروے کا دورہ کیا لیکن اسے اس سانحے پر احتجاج کی توفیق نہیں ہوئی۔ دورے کے دوران ان کے منہ سے ایک بھی احتجاجی لفظ نہیں نکلا بلکہ اس نے قوم سے اس معاملے کو چھپانے کی کوشش کی۔ وہ کہتا ہے کہ میں امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی ہوں، وہ امریکہ کی خاطر وزیرستان پر بمباری کر رہا ہے، اس نے امریکیوں کو پورے ملک میں کھلی چھٹی دی ہوئی ہے۔ ایف بی آئی والے مساجد و مدارس پر چھاپے مارتے ہیں اور علماء و طلبہ کو حراست میں لے لیتے ہیں، وہ یہاں سے اسلام کے نام لیواؤں کو گرفتار کر کے امریکہ کے سپرد کر رہا ہے اور انہیں گوانتانامو بے میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ اس نے امریکی فوج کو قبائلی علاقوں میں کارروائیوں کی اجازت دے رکھی ہے اور امریکی فوج کی بمباری سے بے گناہ اور معصوم شہری شہید ہو رہے ہیں۔ امریکی صدر بش نے ایک پاکستانی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہم نے پاکستانی فوج اور حکومت کو اعتماد میں لے کر باجوڑ پر فضائی حملہ کیا۔ اس بارے میں پرویز مشرف اور حکومت کا یہ کہنا کہ حکومت نے اس پر احتجاج کیا ہے صریحاً جھوٹ ہے۔ وہ یہاں امریکہ کی مرضی کے مطابق

نظام و نصاب تعلیم نافذ کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں جو چھوٹے چھوٹے معصوم بچے قرآن حفظ کرنے کے لیے کسی دوسرے ملک سے آئے ہیں ان کو باہر نکال دو! حالانکہ وہ محمد مصطفیٰ کے اُمتی ہیں ہمارے لیے اجنبی نہیں بلکہ ہمارے جسد کا حصہ ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ”پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ“ کا نعرہ لگا کے یہ ملک بنایا تھا۔ جب پاکستان کا مطلب لا الہ الا اللہ ہے تو پھر یہاں سے کسی معصوم بچے کو دینی تعلیم حاصل نہ کرنے دینا اور اس بنا پر اسے ملک سے نکالنا ناجائز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پرویز مشرف جیسے حکمرانوں کی وجہ سے مسلمان پوری دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں اس لیے تحفظ ناموس رسالت کی تحریک اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک ہمیں امریکہ و یورپ کے ان زرخیز ایجنٹوں سے نجات نہیں مل جاتی۔ ہم اپنے ملک کے عوام سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ اس تحریک میں بھرپور طریقے سے حصہ لینے کے ساتھ ساتھ مغربی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں اور وہی پہنیں، کھائیں اور پیئیں جو ہمارے ہاں تیار ہوتا ہے اور جو چیز یہاں تیار نہیں ہوتی اس کو ہمارے ملک کے تاجر اور صنعتکار تیار کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس موقع کو مصطفوی تہذیب کے فروغ کا ذریعہ بنالیں، ہر جگہ سے فاشی اور بے حیائی کی ساری چیزوں کو ختم کر دیں اور جو مظاہر حضور کے اُمتی کو زیب نہیں دیتے ان سے باز آ جائیں، خواتین باوقار لباس پہنیں اور مرد باوقار کلچر اپنائیں اور حضور کی سیرت کو نمونہ بنا کر اخلاقی بلندی، عدالت، امانت اور صداقت کا اعلیٰ معیار اپنانے کی کوشش کریں تاکہ یہ تحریک پوری دنیا میں مسلمانوں پر اثر انداز ہو اور اس کے نتیجے میں اسلامی اور مصطفوی تہذیب غالب آ جائے۔

اس تحریک کو ٹھنڈا اور کمزور نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو پُر امن طریقے سے آگے بڑھانا چاہیے۔ ہم نے اپنی املاک کو نقصان نہیں پہنچانا اور نہ کسی غریب آدمی کی دکان پر موٹر سائیکل

کو جلانا ہے کیونکہ ہماری تحریک اس وقت مفید ثابت ہوگی جب وہ پُر امن ہوگی۔ ہم لاکھوں کی تعداد میں بڑے شہروں میں جمع ہوں گے اور یہ مطالبہ کریں گے کہ ناموس رسالت کا تحفظ نہ کر سکنے والے حکمران مستعفی ہو جائیں، توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والے ممالک سے سفارتی تعلقات ختم کیے جائیں اور خاکے بنانے والے افراد کو سزا دی جائے مطالبات کی منظوری تک ہماری تحریک جاری رہے گی اور جہاں ہم جلو سوس کی قیادت کریں گے تو انہیں پر امن رکھیں گے اور اپنے ملک کی غیر مسلم اقلیتوں کی جان و مال، عزت و آبرو اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت ہماری دینی ذمہ داری ہے لیکن اگر لیڈر شپ پر پابندیاں لگائی جائیں گی اور انہیں قیادت کرنے سے روکا جائے گا تو پھر لوگ اپنی مرضی کریں گے۔ ہم ہمیشہ لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اور حکومت سے کہتے ہیں کہ اگر اس نے گولی چلانی ہے تو وہ معصوم اور غریب لوگوں کے بجائے ہم پر گولی چلائے اور ہمیں قتل کرے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میں ناموس رسالت پر قربان ہو جاؤں اور یہی ہر کمزور سے کمزور مسلمان کی خواہش ہے۔ میری تمام مسلمانوں سے اپیل ہے کہ اس طرح کے جبری ہتھکنڈوں سے گھبرا کر گھروں میں نہ بیٹھیں بلکہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں اور اس تحریک کو اس کے منطقی انجام تک پہنچائیں۔

یاد رکھیے! ہم نے نہ پرویز مشرف کی حکومت کو قبول کرنا ہے اور نہ روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے جھوٹے نعرے کی آڑ میں اسلامی تہذیب میں کسی تبدیلی کو تسلیم کرنا ہے۔ مصطفوی تہذیب کے غلبے اور اسلامی انقلاب تک ہماری تحریک جاری رہے گی۔



## نام نہاد اعتماد سازی

اکتوبر ۱۹۸۹ء میں مقبوضہ کشمیر میں چلنے والی تحریک آزادی میں تیزی آئی تو بھارت نے اسے کچلنے کے لیے وہاں بے تحاشا فوج بھیج دی جس نے معصوم اور نہتے کشمیریوں پر مظالم کی انتہا کر دی۔ ظلم و تشدد کی ان کارروائیوں سے تنگ آ کر کئی کشمیری خاندان آزاد کشمیر کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئے لیکن یہاں ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ اس وقت کی پاکستانی حکومت نے کشمیر میں جاری جدوجہد آزادی اور بھارتی فوج کے مظالم کو پریس میں آنے سے روک رکھا تھا اور مہاجر کشمیریوں کی دیکھ بھال سے بھی انکاری تھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی نے دنیا کو کشمیریوں کی جدوجہد آزادی اور ان پر ہونے والے مظالم کی طرف توجہ دلانے اور آزاد کشمیر میں ہجرت کر کے آنے والے کشمیریوں کی دستگیری کے لیے ۵ فروری ۱۹۹۰ء کو یومِ یکجہتی کشمیر منانے کا فیصلہ کیا۔ اس دن ملک گیر پہیہ جام ہڑتال اور مظاہروں کے ذریعے کشمیریوں کی مدد و حمایت اور ان سے یکجہتی کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد گزشتہ ۱۶ سال سے جماعت اسلامی کی اپیل پر یہ دن اہل کشمیر اور ان کی جدوجہد آزادی سے اظہارِ یکجہتی اور اس عہد کی تجدید کے لیے منایا جاتا ہے کہ اہل پاکستان اس جدوجہد کو اپنی رگ جان کو پنجہ ہنود سے چھڑانے اور تکمیلِ پاکستان ہی کی جنگ سمجھتے ہیں اور وہ دامے درمے سخنے قدمے اس کے پشتیبانی کرتے رہیں گے۔

کشمیر اور پاکستان لازم و ملزوم ہیں۔ کشمیر کے بغیر پاکستان نہ جغرافیائی طور پر مکمل ہے



اور نہ نام کے اعتبار سے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی طرح پاکستان کا معاشی استحکام بھی کشمیر سے وابستہ ہے۔ ادھر کشمیریوں نے تکمیل پاکستان کی جدوجہد میں بے شمار قربانیاں دی ہیں اور وہاں اٹھنے والا ہر جنازہ ”کشمیر بنے گا پاکستان“ کے حوالے سے مٹی ریفرنڈم ہوتا ہے۔ یہ جدوجہد اب فیصلہ کن موڑ میں داخل ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے حکمران مسئلہ کشمیر پر جموں و کشمیر کی تقسیم کے فارمولے اور آپشن دے رہے ہیں۔ انہوں نے مسئلے کے حل کے حوالے سے ایک درجن سے زائد تجاویز پیش کی ہیں اس بات کا بھی اعلان کیا کہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادیں اب قابل عمل نہیں رہیں اور پاکستان ان قراردادوں سے ہٹ کر مسئلے کے حل کے لیے بات چیت کر سکتا ہے لیکن ہندوستان نے ان کی کسی بھی تجویز کا مثبت جواب نہیں دیا بلکہ دوطرفہ مذاکرات کے سلسلے میں پاکستان آنے والے بھارتی حکام نے آزاد کشمیر کو بھی اپنا حصہ قرار دیا اور کہا کہ پاکستان نے اس پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور اگر وہ یہ قبضہ چھوڑ دے تو مسئلہ کشمیر آج ہی حل ہو سکتا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مذاکرات کے کئی دور ہوئے جن کا مرکزی موضوع مسئلہ کشمیر تھا لیکن مذاکرات کے دوران کسی بھی مرحلے پر اس مسئلے پر کوئی سنجیدہ گفتگو اور حوصلہ افزا پیش رفت نہیں ہوئی بلکہ یہ تاثر زور پکڑ رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر کو اندھے غار میں دھکیلا جا رہا ہے۔

کشمیریوں نے بس سروس ریاست سے فوجی انخلا، سیلف گورننس اور یونائیٹڈ سٹیٹس آف کشمیر کے فارمولوں پر بات کرنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے قربانیاں نہیں دیں بلکہ ان کی منزل اسلام اور پاکستان ہے اور وہ اپنے حق خود ارادیت کے حصول کے لیے اپنی جوانیاں لٹا رہے ہیں۔ بے نتیجہ مذاکرات، رقاصاؤں اور ناچنے والیوں کے تبادلے، ادب بگھارنے والے خود ساختہ دانشوروں کی آمد و رفت، منقاد پرست تاجروں کے آنے جانے اور کنٹرول لائن کو کھولنے جیسے اقدامات سے کشمیریوں کی حالت زار میں کوئی فرق نہیں

آیا ہے۔ کشمیری اب بھی لٹ رہے ہیں ان پر گولیاں برس رہی ہیں۔ بچے بوڑھے اور جوان شہید ہو رہے ہیں اور عفت مآب خواتین کو دامن عصمت سے محروم کیا جا رہا ہے۔ اس صورتحال میں بھارت کو رعایت دینا اور اصولی موقف سے دستبرداری اختیار کرنا پاکستان اور کشمیریوں کے مفاد میں نہیں ہے۔

آزاد کشمیر میں زلزلے کے بعد کنٹرول لائن کو پانچ مقامات سے کھولنے کی تجویز دے کر صورتحال کو مزید گھمبیر بنا دیا گیا ہے۔ کنٹرول لائن کو سافٹ بارڈر کی حیثیت دینا بھارتی سکیم کا حصہ ہے اس لیے اس نے اس تجویز کو شرف قبولیت بخشا ہے۔ یہ کنٹرول لائن کو مستقل سرحد بنانے کی طرف پیش قدمی ہے۔

ادھر مقبوضہ کشمیر میں حریت کانفرنس کو بھی تقسیم کر دیا گیا ہے۔ گزشتہ سال دورہ دہلی کے دوران جب سید علی گیلانی نے مسئلہ کشمیر کے حوالے سے حکومت پاکستان کے اقدامات سے اختلاف کیا تو اسے ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا گیا۔ اب وہاں مصنوعی قیادت کو آگے بڑھایا جا رہا ہے جو کشمیریوں کے بنیادی موقف کو پس پشت ڈال کر مشرف پالیسی کی حمایت اور کشمیریوں کے زخموں پر نمک پاشی کے لیے آمادہ اور تیار ہو گئی ہے لیکن اسے کشمیری عوام کا اعتماد ہرگز حاصل نہیں ہے۔ سید علی گیلانی ہی کشمیریوں کے متفقہ قائد ہیں اور ہم ان کی بے مثال جدوجہد اور استقامت پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ تحریک آزادی کشمیر میں سید علی گیلانی کا کردار اور مرکزیت ناقابل تردید حقیقت ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے پاکستان سے محبت کی پاداش میں اپنی زندگی کا بیشتر عرصہ بھارتی عقوبت خانوں میں گزارا ہے۔ پاکستانی عوام انہی لوگوں کا ساتھ دیں گے جو کشمیر میں پاکستان کے مفادات کی ترجمانی کر رہے ہیں اور اپنے مفاد کو پاکستان کے ساتھ دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں۔

۳۵ — مضامین قاضی حسین احمد

اس پس منظر میں اس سال ۵ فروری زیادہ جوش و جذبے اور زیادہ بلند آہنگی سے منانے کی ضرورت ہے تاکہ کشمیر کے حوالے سے مشکوک سرگرمیوں، متفقہ قومی پالیسی سے انحراف اور کئی آپشنز کھلے رکھنے پر قوم کے عدم اعتماد کا اظہار ہو اور انہیں یہ پیغام دیا جائے کہ قوم اس مسئلہ پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اہل کشمیر کی حق خود اختیاری کے سوا کسی اور آپشن کو ہرگز قبول نہیں کرے گی اور وہ اعتماد سازی کے نام پر کیے جانے والے اقدامات مثلاً کنٹرول لائن پر بارڈر، مظفر آباد دوسری نگر دوستی بس سروس اور باہمی تجارت کو اصولی موقف سے دستبرداری اور شکست و پسپائی کا سفر تصور کرتی ہے۔ آج کے دن تمام پاکستانی، بچے، بوڑھے، جوان اور خواتین کشمیری عوام کی پشتیبانی کے لیے میدان عمل میں نکل آئیں اور شہر شہر گلی گلی کشمیریوں کی حمایت میں بے مثال مظاہرے کریں اور انسانی ہاتھوں کی لمبی زنجیریں بنائیں۔ اسی طرح تمام سیاسی و دینی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے سیاسی و گروہی اختلافات کو پس پشت ڈالتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے بارے میں ایک متفقہ قومی حکمت عملی اختیار کریں اور باہم مل کر ملک بھر میں ایسی فضا قائم کریں کہ پوری قوم حکومت پاکستان کے اقدامات سے برأت کا اعلان کرتے ہوئے تحریک آزادی کشمیر جو دراصل تکمیل پاکستان کی تحریک ہے کی حمایت میں اس طرح اٹھ کھڑی ہو کہ ۵ فروری کے بعد بھی یکجہتی کشمیر مہم بھی جاری رہے۔

(فروری ۲۰۰۶ء)



## دہشت گردی کے الزام اور اُمت مسلمہ -۱

کیا اُمت مسلمہ عدل و انصاف کی علم بردار اُمت وسط ہے جو انسانیت پر گواہ بنا کر لوگوں کی فلاح اور اللہ کی خاطر گواہی دینے کا فریضہ ادا کرنے کے لیے بھیجی گئی ہے یا یہ اُمت دہشت گرد اور انتہا پسند ہے جو دنیا میں فساد اور افراتفری مچا رہی ہے؟

آج پوری دنیا کو اس سوال کے جواب کی بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ صیہونی لابی اور ان کے زیر کنٹرول ذرائع ابلاغ شب و روز اسلام کو دہشت گردی اور انتہا پسندی کے مترادف قرار دینے میں مصروف ہیں۔ اس مقصد کے لیے نہ صرف تجزیاتی تبصرے ہو رہے ہیں، دستاویزی فلمیں، ڈرامے اور ناول تیار کیے جا رہے ہیں بلکہ عملاً بھی دہشت گردی کے بڑے واقعات کا ارتکاب کر کے انہیں اسلام اور مسلمانوں کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے تاکہ ایک عام آدمی کے ذہن میں اسلام اور مسلمان کا ایک بدنما اور خونخوار تصور قائم کیا جائے اور وہ حقیقت کو معلوم کرنے اور سچائی کو قریب سے دیکھنے کے بجائے دُور ہی سے اسلام سے متنفر ہو جائے۔

مغرب صیہونی پروپیگنڈے سے اس قدر متاثر ہے کہ بقول اقبال ”فرنگ کی رگ جاں پنجہ، یہود میں ہے“۔ ۱۰۰ سالہ منصوبہ بندی کے تحت منظم کام کے نتیجے میں یہود نے عیسائی مغربی دنیا میں اس قدر اثر و رسوخ حاصل کر لیا ہے کہ پہلے یہودی جس مغرب میں شہروں کے مخصوص محلوں (Ghettos) میں محصور ہو کر رہتے تھے اور اپنی مخصوص ثقافت کی



وجہ سے نفرت کے مستحق تھے اسی مسیحی مغرب کے باسی اب اپنی ثقافت کو Judo-Christian (یہودی عیسائی) کلچر قرار دے کر مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں نے بھی مغربی تہذیب و ثقافت سے رشتے جوڑ لیے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کو پوری دنیا میں الگ تھلگ کرنے کی تحریک جاری ہے۔

ہمارے حکمران جنہوں نے مغربی تہذیب کی آغوش میں پرورش پائی ہے اس منظر سے خوفزدہ ہیں۔ ان سے یہ نہیں ہو سکا کہ وہ ہمت کر کے اس صورتحال کے سدباب کے لیے صحیح سمت میں درست منصوبہ بندی کریں اور اپنے قیمتی اسلامی ورثے کو سینے سے لگا کر اسی پیغام کو عام کر دیں جس کے ذریعے انہیں ایک ہزار سال تک پوری انسانیت میں پذیرائی ملی تھی اور مغرب و مشرق کے سفید فام و سیاہ فام انسانوں نے ان کی قیادت قبول کر لی تھی۔ وہ یہ حقیقت فراموش کر رہے ہیں کہ ”ہم وہ قوم ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے عزت و سرفرازی بخشی اور جب بھی ہم اسلام کے بغیر کسی اور چیز میں عزت کے متلاشی ہوں گے اللہ تعالیٰ ہمیں ذلت سے دوچار کر دے گا۔“ مسلمانوں کے حکمران مغرب کی خوشنودی کے لیے خود امت مسلمہ کو اپنا طرز زندگی تبدیل کرنے اور نام نہاد اعتدال پسندی اور روشن خیالی کے نام پر مادر پدر آزاد مغربی تہذیب و ثقافت اپنانے کی تلقین کر رہے ہیں۔

اپنے دین اور اپنی ثقافت کے ساتھ منسلک رہنے کو انتہا پسندی کا نام دیا جا رہا ہے۔ اکثر مسلم ممالک میں دینی مدارس کو مطعون و محصور کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ دینی مدارس میں انتہا پسندی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسلم ممالک کو ایک دوسرے سے کاٹا جا رہا ہے۔ پاکستان کو بھی امت کے نوجوانوں، طالب علموں اور سیاہوؤں کے لیے شجر ممنوعہ بنایا جا رہا ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یہاں تمام دروازے چوپٹ کھلے

ہیں لیکن کسی مصری، الجزائری اور سوڈانی کے لیے پاکستان کا ویزا حاصل کرنا امریکہ اور یورپ کا ویزا حاصل کرنے سے مشکل تر بنا دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ ایک منظم منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے تاکہ اُمت کا تصور ختم کر دیا جائے۔ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ناقابلِ عبور دیواریں کھڑی کر دی جائیں اور انہیں آپس میں متحد ہونے کے بجائے دوسری اقوام کی قیادت و سیادت میں ثانوی حیثیت قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن میں طیاروں کے اغوا کے واقعے کی پوری ذمہ داری بغیر کسی ثبوت کے پہلے ہی دن سے مسلمانوں اور القاعدہ پر ڈال دی گئی اور پھر القاعدہ کو تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری طالبان کی حکومت پر ڈال کر افغانستان پر فوج کشی کر دی گئی۔ اب حال ہی میں لندن کے زیر زمین ریلوے سسٹم اور ٹرانسپورٹ بسوں میں دھماکے ہوئے جن میں بے گناہ اور معصوم لوگ ہلاک ہوئے۔ اس کی ذمہ داری بھی بغیر کسی ثبوت کے مسلمانوں پر ڈال دی گئی ہے۔ برطانیہ ہی نہیں، پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نئے سرے سے اقدامات شروع ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ کسی جواز و منطق کے بغیر پاکستانی مدارس سے معصوم بچوں کو اٹھا کر ملک بدر کیا جا رہا ہے۔ انہیں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنے پر مجبور کرتے ہوئے ان کا مستقبل تاریک و مخدوش کیا جا رہا ہے۔ نائن الیون اور سیون سیون مسلمانوں کے خلاف دو حوالے بنا دیے گئے ہیں۔ اُمت مسلمہ کے سامنے ایک بڑا سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح اس تہذیبی یلغار کا مقابلہ کرے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں صحیح اور درست راستہ کونسا ہے؟ نائن الیون اور سیون سیون کے ذمہ داران کون ہیں؟ ان واقعات کے بارے میں اسلامی تحریکوں کا موقف کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے؟

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن کے ہیبت ناک واقعات کو ٹیلی ویژن پر پوری دنیا نے دیکھا۔ یہ واقعات بلا تفریق مذہب و ملت پوری انسانیت کے لیے صدمے، خوف اور

حیرت کا باعث بنے۔ امریکی سر زمین پر امریکی قوم ہمیشہ سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ نائن الیون کے واقعات سے امریکی قوم بھی ایک اچانک صدمے سے دوچار ہوئی۔ اسلامی تحریکوں نے بھی دنیا بھر کے ممالک اور تنظیموں کے ساتھ ملکر اس واقعے کی مذمت کی۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کا موقف بیان کرتے ہوئے میں نے ۱۴ ستمبر ۲۰۰۱ء کو خطبہ جمعہ میں کہا تھا کہ: ”اس واقعے پر ہمیں انتہائی صدمہ ہوا ہے۔ اس میں ہر قومیت اور مذہب کے لوگ مارے گئے ہیں جن میں مسلمان اور پاکستانی بھی تھے۔ کوئی مذہب بے گناہ افراد کے قتل کی اجازت نہیں دیتا۔ امریکہ کو چاہیے کہ ان واقعات پر جذباتی رد عمل کا شکار نہ ہو بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اس کے اسباب، محرکات اور وجوہات تلاش کرے یہ اس کے اپنے مفاد میں ہے۔ پاکستان پر دباؤ ڈالنا اور اس سے افغانستان پر حملے کی صورت میں ہوائی اڈے اور تعاون مانگنا یہ تباہی و بربادی کا راستہ ہے جس کا کڑوا پھل امریکہ پہلے ہی چکھ رہا ہے۔ اس کی بجائے اسے عدل و انصاف اور حکمت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ امریکہ کو داخلی طور پر بھی انصاف کا نظام قائم کرنا اور اخلاقی برائیوں کو دور کرنا چاہیے۔ دنیا میں جہاں بھی ظلم ہو رہا ہے جب تک اس کا ازالہ نہیں ہوگا، امن قائم نہیں ہو سکتا۔ کشمیر، چینیا اور فلسطین میں ظلم ڈھایا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں ظالموں اور ان کے سرپرستوں کے خلاف رد عمل پیدا ہو رہا ہے۔

امریکہ کو اپنی غلطیوں کا بھی جائزہ لینا چاہیے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس واقعے سے یہودی کیا کیا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسے مکمل غیر جانبداری سے جائزہ لینا چاہیے کہ اس سانحے کے پیچھے اس کی آڑ میں مفادات سمیٹنے والے یہودیوں کا ہاتھ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس وقت پوری دنیا کی کوشش ہونی چاہیے کہ وہ امریکہ کو بتائے کہ وہ جذباتی رد عمل کا اظہار کرنے کے بجائے اصل حقائق تلاش کرے۔



امریکہ کو سپر طاقت ہونے کا زعم ہے، وہ فلسطینیوں کے قتل و غارتگری کے باوجود یہودیوں کی سرپرستی کر رہا ہے۔ امریکہ کی سیاست ظلم پر مبنی ہے۔ کمزور اقوام کو ذلیل کرنے اور ان پر اپنا طرز زندگی اور تہذیب و اقدار مسلط کرنے کے نتیجے میں ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ امریکہ نے خود ہر طرح کا اسلحہ اور جراثیمی ہتھیار جمع کر رکھے ہیں جن کے ذریعے ایسے امراض پھیلانے جاسکتے ہیں جن کا کوئی علاج نہیں۔ کیا اس طرح کے ہتھیار جو پوری قوم کو تباہ کر دیں، کسی کے خلاف استعمال کرنا دہشت گردی نہیں ہے؟ ان ہتھیاروں سے ساری دنیا پاک ہونی چاہیے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب امریکہ، روس اور برطانیہ بھی ایسے ہتھیار تلف کر دیں۔ وہ خود تو اس کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن جن کمزور اقوام کے پاس یہ ہتھیار اپنے تحفظ کے لیے ہیں ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ ایسے ہتھیار ختم کریں۔ یہ دور ٹیکنالوجی کا دور ہے، اس میں جنیں گے تو سب جنیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ طاقتور اقوام جنیں اور غریب قومیں مٹ جائیں۔ عدل و انصاف کے ساتھ سب جی سکتے ہیں، ظلم کے ساتھ نہیں۔

لندن بم دھماکوں کے بعد بھی تمام اسلامی تحریکوں نے اپنے اس موقف کا اعادہ کیا۔ اس موقع پر اخوان المسلمون کا موقف واضح کرتے ہوئے مرشدِ عام محمد مہدی عارف نے فرمایا: ”لندن کے قلب میں ہونے والے دھماکوں سے جن کے نتیجے میں ۴۰ افراد ہلاک اور ۱۹۰ زخمی ہو گئے ہیں، اخوان المسلمون کو شدید صدمہ پہنچا ہے۔ وہ اس مجرمانہ کارروائی کی شدید مذمت کرتے ہیں اور اسے اسلامی تعلیمات سے متصادم قرار دیتے ہیں کیونکہ اسلام نے انسانی جان کی حفاظت کا حکم دیا ہے اور شہری آبادیوں کو خوفزدہ کرنے سے سختی سے منع کیا ہے۔“

اخوان المسلمون کی سوچی سمجھی رائے ہے کہ عالمی سطح پر وسیع تر تشدد، عدم استحکام اور



دہشت گردی کی یہ لہر امریکی اور برطانوی حکومتوں کی ان پالیسیوں کا براہ راست نتیجہ ہے جن میں انہوں نے عدل و انصاف کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ انہوں نے تمام عالمی قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے طاقت کے اندھے استعمال ہی کو قانون قرار دے رکھا ہے اور دنیا کو جنگل کے قانون کی طرف دھکیل دیا ہے۔

اس سے پہلے نومبر ۲۰۰۲ء رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ میں اخوان المسلمون اور دنیا کی دیگر اسلامی تحریکوں نے لندن ڈیکلریشن کے نام سے مغربی اقوام اور مغرب میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے اپنا اصولی موقف جامع انداز میں پیش کیا جس کے چند اہم نکات یہ تھے:

○ یہ کہ غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و آبرو اسی قانون کے تحت قابل احترام ہے جس کے ذریعے خود انہیں رہائش کا حق دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اپنا عہد پورا کرو“۔ (۳۴:۱۷)

○ ملکی قوانین کا احترام کیا جائے معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جائے اور اسے نقصان پہنچانے سے پرہیز کیا جائے۔

○ بھرپور کوشش ہو کہ تعلیمی اداروں، تعلیمی و ثقافتی مراکز کے قیام کے ذریعے ایک ایسی نئی نسل تیار کی جائے جو سچی مسلمان اور مفید شہری ثابت ہو۔

○ اللہ کی رستی (دین) اخوت، رواداری کو مضبوطی سے تھاما جائے۔ نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کیا جائے۔ متنازعہ امور میں مکالمے اور موعظہ حسنہ کو اپنایا جائے اور ان امور سے دور رہا جائے جو مختلف قومیتوں میں نفرت کا باعث ہوں ان تمام نقطہ ہائے نظر اور طریقوں سے اجتناب کیا جائے جو دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے تاثر کو مسخ کرنے کا باعث ہوں۔

○ اس بات کی مقدور بھر کوشش کی جائے کہ نیک اور مفید کاموں میں دوسروں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون ہو، انسانیت کے درمیان باہمی اتفاق رائے کے نکات کو رواج دیا جائے مثلاً باہمی تعلقات کا فروغ، آزادی رائے، انسانی حقوق، ماحول کی آلودگی، نفرت کے بجائے محبت کا فروغ اور جنگ کے اسباب کی مخالفت وغیرہ۔

○ جن ممالک میں وہ رہائش پذیر ہیں وہاں اسلام کو بطور سرکاری مذہب تسلیم کرانے کیلئے بھرپور اور متحدہ کوشش کی جائے تاکہ وہ بھی ان حقوق اور آزادیوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں جو غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں حاصل ہیں۔

○ اسلامی تعلیمات اور مروجہ قوانین کی حدود میں رہتے ہوئے لبرل قوتوں سے بھی انسانی حقوق اور انسانیت سے متعلق امور میں مذہب اور قومیت کی تمیز کے بغیر تعاون کیا جائے۔

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ اسلامی تحریکوں کا موقف عدل و انصاف کے سنہرے قرآنی اصولوں پر مبنی ہے۔ انتہائی اشتعال انگیزی کے موقع پر بھی ہم نے کبھی عدل و انصاف کا دامن نہیں چھوڑا۔ قرآن کا فرمان ہے: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔“

اس وقت عالم انسانیت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ طاقتور اقوام کی خارجہ پالیسی عدل و انصاف کے بجائے اپنے محدود قومی مفادات کے تحفظ پر مبنی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر ہر اخلاقی اصول کو پامال کرنا ان کی نظر میں جائز ہے۔ خلیج کی ریاستوں میں امریکی پالیسی کی

وضاحت کرتے ہوئے امریکہ کے ایک سابق سفیر اور معروف دانشور مارٹن انڈیک اپنی کتاب International Interest in the Gulf Region میں امریکی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: ”خلیج کے بارے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سلامتی کی حکمت عملی (Security Strategy) کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ خلیجی ریاستوں کے تیل کے چشموں سے ضرورت کے مطابق تیل کی فراہمی مناسب قیمتوں کے ساتھ جاری رہے۔“

اس مقصد کے لیے عراق پر جنگ مسلط کر دی گئی، عراقی فوج کا خاتمہ کر دیا گیا، لاکھوں لوگ مار ڈالے گئے، پورے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، پوری قوم فساد اور قتل و غارت کی نذر کر دی گئی، اسے تذلیل و تحقیر کا نمونہ بنا دیا گیا، ابو غریب میں ”احترام آدمیت“ کی ”اعلیٰ مثالیں“ قائم کی گئیں۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے کہ ہمیں تیل چاہیے ”ہمارا سلامتی کا منصوبہ اس کا تقاضہ کرتا ہے۔“

یہ بحث الگ ہے کہ کیا امریکہ عراق میں اپنے اہداف حاصل کر سکے گا یا نہیں؟ یہ بھی ایک بڑا سوالیہ نشان ہے کہ وہاں اس کا مالی اور جانی نقصان اسے وہاں مزید کتنی مہلت دیتا ہے۔ کیونکہ اب تو اس کے اکثر پالیسی ساز، عراق پر حملے کے فیصلے سے خود کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۱۸ اگست کو تین ایسی خفیہ دستاویز جاری کی گئی ہیں جن میں امریکی صدر کو خبردار کیا گیا تھا کہ عراق پر حملہ خطرناک اور مہلک ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک دستاویز خود امریکی وزارت خارجہ نے حملے سے تقریباً ایک ماہ پہلے ۷ فروری ۲۰۰۳ء کو تیار کی تھی۔

سلامتی کی حکمت عملی کے نام پر ہی عالم عرب کے عین قلب میں ایک مصنوعی یہودی ریاست کا خنجر گھونپا گیا تھا۔ فلسطین ہزاروں سال سے آباد خطہ تھا۔ کوئی بیابان یا غیر آباد



صحرائی علاقہ نہیں تھا۔ ایک بین الاقوامی سازش کی خاطر استعماری ممالک نے مل کر یہاں سے فلسطینیوں کے اخراج اور یہودیوں کی آبادی اور بالآخر ایک خود مختار یہودی ریاست کے قیام کا فیصلہ کیا اور اس ریاست کو اپنے مخصوص مفادات (Strategic Interests) کے تحفظ کی خاطر پڑوس کی تمام ریاستوں پر فوجی اعتبار سے بالادست بنا دیا۔ امریکہ کے سابق وزیر خارجہ کولن پاول کے بقول: ”اسرائیل کی سلامتی کی خاطر اس پر سے خوف کے سارے خطرات کو ہٹانا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے۔“ چنانچہ اس غرض کے لیے کسی مسلمان ملک کے پاس ایٹمی توانائی کا وجود امریکہ کو قابل قبول نہیں ہے اور کسی مسلمان ملک کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی سلامتی اور دفاع کے لیے ایسے ہتھیار رکھے جن کے ذریعے وہ دشمن کو خود سے دور رکھ سکے جبکہ اسرائیل کو دوسروں کی حدود میں مداخلت کی کھلی اجازت ہے۔ اسرائیل اپنی ان حدود سے بھی باہر نکل گیا ہے جو اقوام متحدہ میں بڑی طاقتوں نے ناجائز طور پر اس کے لیے مقرر کی تھیں۔ جنگ کے ذریعے دوسروں کے علاقوں پر قبضہ کرنے کو اقوام متحدہ نے ناقابل قبول قرار دیا ہے لیکن اگر یہ علاقے مسلمانوں کے ہوں تو قابض چاہے اسرائیل ہو چاہے بھارت ان کے لیے یہ قبضہ جائز قرار پاتا ہے۔ اس لیے اسرائیل کو اپنے چاروں طرف کے علاقوں پر قبضے کا حق ہے کیونکہ اسے اپنی سلامتی کے لیے محفوظ سرحدوں کی ضرورت ہے۔



## دہشت گردی کے الزام اور اُمت مسلمہ - ۱۱

مغربی پالیسیوں کا ایک اور اہم نکتہ دنیا میں جمہوریت کی ترویج ہے۔ امریکہ نے جمہوریت رائج کرنے کی خاطر وسیع تر مشرق وسطیٰ کا منصوبہ پیش کیا ہے جس کی سرحدیں پورے عالم اسلام کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ شخصی حکومتوں کا خاتمہ کر کے اقتدار عوام کے سپرد کرے گا۔ وہ خود کو بنیادی انسانی حقوق کا علم بردار قرار دیتا ہے۔ اس کی نظر میں جمہوریت ہی ایک مستحکم سیاسی نظام فراہم کرتی ہے اور آزاد عدلیہ جمہوریت کا بنیادی ستون ہے لیکن جن جن ممالک میں ان کے مفادات تقاضا کرتے ہیں کہ وہاں فوجی اور سول آمر اپنے عوام پر مسلط رہیں، مطلق العنان شخصی حکمرانی ہو وہاں وہ اپنی تمام توانائیاں اسی فوجی آمر یا جابر حکمران ہی کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان ڈکٹیٹروں کو اپنی اقوام پر مسلط کرنے کے لیے غیر ملکی افواج کی ضرورت ہو تو سیاسی استحکام کے نام پر یہ بھی جائز قرار دیا جاتا ہے۔

الغرض اپنی فوجی، معاشی اور تہذیبی برتری (Hegemony) قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے ہر طرح کے عسکری، معاشی اور ابلاغیاتی جارحانہ اقدامات مغربی ممالک کے لیے عین انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہیں اور ان اقدامات کی مخالفت ان کی نظر میں دہشت گردی اور انتہا پسندی ہے۔ اسلامی تحریکوں نے اشتعال کے باوجود ایک عادلانہ موقف اختیار کیا لیکن مغربی ممالک اس پر راضی نہیں ہیں۔ وہ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ

ہم بقول ان کے ”دہشت گردی“ اور ”انتہا پسندی“ کے مقابلے میں حکمرانوں کی طرح ان کا ساتھ دیں۔ اس مقصد کے لیے وہ ہماری تہذیب و ثقافت ہی نہیں عقیدہ و ایمان بھی تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن کریم کو (نعوذ باللہ) نفرت کی تعلیم دینے والی کتاب ثابت کر کے اسے نئی نسلوں کے ذہنوں سے کھرچنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نصابِ تعلیم کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں، اس میں سے قرآنی تعلیمات اور رسول اکرم کے ارشادات نکال کر ذہنی آوارگی پر مشتمل مواد شامل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جہاد کو دہشت گردی کے مترادف قرار دینا چاہتے ہیں۔ دینی مدارس ہی سے نہیں، کالجوں اور اسکولوں کے نصاب سے بھی جہاد کے ذکر کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جہاد کی تعلیم کو دہشت گردی کی تعلیم قرار دے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم بھی ان تمام اقدامات کو جائز قرار دیں جنہیں وہ اپنی سلامتی کے لیے لازمی سمجھتے ہیں۔

ان کے اس ناروا مطالبے کے جواب میں امتِ مسلمہ کے عادلانہ موقف کو وضاحت کے ساتھ اور یک آواز ہو کر بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ عالمِ اسلام کے تمام علما و دانشور اور ماہرین اپنی حکومتوں کے اثرات سے آزاد ہو کر قرآن و سنت کے اصولوں کی روشنی میں اپنا موقف بیان کریں اور مغربی ممالک میں حق و انصاف کی بات سمجھنے والوں کو بھی اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کریں۔ عالمِ انسانیت کو اس طرح کے ایک گروہ کی ضرورت ہے جو جغرافیائی، نسلی اور مذہبی گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر پوری انسانیت کی بھلائی کی سوچ رکھتے ہوں۔ مبنی بر انصاف بات کرنے والے خود مغرب میں موجود ہیں۔ وہاں کے کروڑوں لوگوں نے جنگ مخالف مظاہرے کیے ہیں۔ لندن کے میئر کین لیونگسٹن جو خود بھی ٹونی بلیئر کی حکمران پارٹی کا اہم اور مؤثر رکن ہے نے برملا کہا ہے کہ ”اگر برطانیہ کے لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جو فلسطینی اور عراقی عوام کے ساتھ کیا جا رہا ہے تو یہاں بھی خود کش حملہ آور پیدا ہو جائیں گے“۔ انہوں نے سوال کیا ہے کہ اگر برطانوی شہریت رکھنے والا کوئی مسلمان

اسرائیلی فوجوں کے مظالم دیکھ کر اپنے فلسطینی بھائیوں کی مدد کے لیے چلا جائے تو ہم اسے دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی برطانوی یہودی فلسطینیوں پر ظلم ڈھانے کے لیے جا کر اسرائیلی فوج میں بھرتی ہو جائے تو ہم اسے کیوں اس کا قانونی حق سمجھتے ہیں؟ یہ دہرے معیار ترک کرنا ہوں گے۔

اسی طرح جارج گیلوے جو برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں، انصاف کے علم بردار اور عراق پر جنگ مسلط کرنے کے شدید ترین مخالف کے طور پر عالمی اُفق پر ابھرے ہیں۔ امریکی دانشوروں پال فنڈ لے اور گراہم وولر جیسے لوگوں نے بھی امریکی پالیسیوں کو مکمل طور پر یہودی ذہنیت اور سازشوں کے تابع قرار دیتے ہوئے ان پر نظر ثانی کی بات اٹھائی ہے۔ انصاف کی یہ آوازیں خود مغربی ممالک کے مفاد میں ہیں۔ حال ہی میں انہی خیالات کے حامل کچھ دانشوروں اور مغربی ممالک کے سیاسی اور سلامتی کے مشیروں سے اسلامی تحریکوں کے کچھ افراد کو تین روز تک باہمی تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ آج مغربی ممالک میں اچھی خاصی تعداد ایسی موجود ہے جو امریکی صدر بش اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کی پالیسیوں کو خود امریکہ اور برطانیہ کے مفادات کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اُمت مسلمہ کے ساتھ مستحکم اور دیرپا تعلق قائم کرنا عالمی امن کے لیے ضروری اور پوری انسانیت کے مفاد میں ہے۔ وہ اپنی حکومتوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہمیں دوسروں کے خلاف طاقت کے بے دریغ استعمال سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ اس کے نتیجے میں ہم ایک ایسی دلدل میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنے کے لیے مغربی ممالک کو مسلمانوں کی حقیقی ترجمان تحریکوں سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ حقیقت بخوبی جانتے ہیں کہ عالم اسلام کے موجودہ حکمران اُمت کی اکثریت کے اعتماد سے محروم ہیں۔

مغربی ممالک کی قیادت کو جلد ہی معلوم ہوگا کہ حالات کو درست طریقے سے پڑھنے



کے لیے ”صیہونی عینک“ کے بجائے انہیں اپنی نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انسانیت کے مستقبل کو محفوظ کیا جاسکے۔ مغربی ممالک کا مفاد بھی اسی سے وابستہ ہے۔ اگر اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تو اسلامی ممالک اور اسلامی تحریکوں کی طرف سے انسانیت کے وسیع تر مفاد کی خاطر عالمی امن کے تحفظ کے لیے پورے دلائل کے ساتھ ایک متفقہ موقف پیش کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے عالمی سطح پر ایک اعلیٰ سطحی سیمینار کا انعقاد اور دنیا کے تمام انصاف پسند عناصر کے درمیان گفت و شنید وقت کا اہم تقاضا ہے جس میں اہم مسلم شخصیات اور اسلامی تحریکوں کے نمائندوں کے علاوہ مسلمان حکام کے نمائندے بھی شامل ہوں اور مسلمان عوام کے ہر مؤثر طبقے کی نمائندگی بھی ہو۔ کئی روز تک کھل کر اظہارِ خیال کیا جائے۔ مغربی ممالک کے مبصرین کو بھی شریک کیا جائے اور واضح دلائل اور عالمی حالات کی روشنی میں ایک متفقہ موقف مرتب کر کے پوری دنیا میں پیش کر دیا جائے اور اس کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے کہ اس کی زد کس پر پڑتی ہے۔ نہ کسی کی بے جا حمایت کی جائے نہ کسی کی خواہ مخواہ مخالفت کی جائے تاکہ پوری انسانیت دیکھ لے کہ ہم عدل و انصاف کے علم بردار امت ہیں انصاف پر قائم اور اللہ کے لیے گواہ ہیں۔ تمام علاقائی نسلی اور لسانی تعصبات سے پاک امت ہیں۔ انسانیت کے خیر خواہ اور خدمت گزار ہیں۔

(ستمبر ۲۰۰۵ء)

## فوجی حکومت اور عوام کے جمہوری حقوق

پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو فوجی حکومتوں کے طویل ادوار میں عوام کے جمہوری حقوق کی صورتحال دگرگوں نظر آتی ہے۔ آج بھی صورتحال مختلف نہیں ہے۔ جنرل پرویز مشرف صاحب نے ملک میں ایک ایسے نظام حکومت کی داغ بیل ڈالی ہے جس میں فرد واحد کی اختیارات کا مالک ہے۔ وہی افواج کا سربراہ ہے، وہی مملکت کا بااختیار صدر ہے، وہی قومی سلامتی کونسل کا صدر نشین ہے، غرض وہ ملک و قوم کے سیاہ و سفید کا بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ ہر اہم معاملے میں آخری فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ داخلی اور خارجی تمام امور میں حکومتی اعیان و انصار اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ پارلیمنٹ سے بھی بالاتر ہے۔ وزیراعظم اس کا ایک نمائندہ ہے۔ حکومتی پارٹیاں اس کے گرد متحد ہیں اور اس کی ہر پالیسی اور ہر اقدام کی موید ہیں۔ اس کے علاوہ کسی فرد یا ادارے کی یہ مجال نہیں کہ کسی بھی اہم معاملے میں وہ کوئی آخری اور حتمی فیصلہ کر سکے۔

فوجی اصطلاح میں اسے Unity of Command کہتے ہیں۔ پرویز مشرف کے مطابق یہ صورت حال ملک کے سیاسی اور معاشی استحکام کی ضمانت ہے۔ پرویز مشرف صاحب کے ان کئی اختیارات کا منبع وہ فوجی انقلاب ہے جو پاکستانی فوج نے اس وقت برپا کیا جب پرویز مشرف صاحب ہوائی جہاز کے ذریعے بیرون ملک دورے سے واپس آ رہے تھے اور اس وقت کے وزیراعظم نے ان کے ہوائی جہاز کو رُخ موڑنے کا حکم دے دیا

تھا۔ کورکمانڈروں کے اجتماعی فیصلے کے تحت وزیراعظم کا یہ حکم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا اور اس طرح ایک فوجی انقلاب برپا ہو گیا۔

### سابقہ حکومت کی غلطیاں اور موجودہ حکمران:

بلاشبہ حالات کو یہاں تک لانے میں میاں نواز شریف کی غلطیاں بھی شامل تھیں۔ میاں صاحب بھی کئی اختیارات کے آرزو مند تھے۔ پہلی بار جب اسلامی جمہوری اتحاد آئی جے آئی کے تحت وزیراعظم بنے تو ایک آئینی ترمیم کے ذریعے مختار کل بننا چاہتے تھے۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ان عزائم کو چھوڑ کر ایک مہذب اور شائستہ جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالیں۔ کئی اختیارات فقط اس ذات بے ہمتا کو حاصل ہیں جس کا علم کامل ہے جو سمیع و بصیر، جو علیم و خبیر ہے اور جس کے ہاتھ میں پوری کائنات کے اقتدار کی کنجیاں ہیں اور وہی بادشاہی کا مالک ہے۔

ہم نے اُن سے بھی گزارش کی کہ ملک و ملت کا مفاد آئینی ضابطوں کی پابندی میں ہے۔ تقسیم کار کے لیے اداروں کی تشکیل کریں اور ان پر اعتماد کریں۔ عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ کر دیں۔ انصاف اور عدل پر مبنی فیصلے کرنے کے لیے عدلیہ کی بالادستی کو دل سے تسلیم کریں۔ قرآن و سنت کو آخری مرجع تسلیم کر کے تنازعات کو اللہ اور رسولؐ کے احکام کے مطابق حل کرنے کے لیے دل و جان سے آمادہ ہوں گے۔ میاں نواز شریف یہ برادرانہ مشورہ قبول کرنے کے بجائے ہم سے ناراض ہو گئے۔ مجبوراً ہم اسلامی جمہوری اتحاد سے علیحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد میاں صاحب کا اقتدار بھی زیادہ عرصہ باقی نہیں رہا۔ اب معلوم نہیں کہ میاں صاحب نے اس ساری صورت حال سے کہاں تک سبق حاصل کیا ہے۔

اپنا کام نکالنے کے لیے امریکہ اور اس کے مغربی حواریوں نے پرویز مشرف صاحب کو یہ پٹی پڑھائی ہے کہ وہ عبقری صلاحیتوں کے مالک ہیں اور ان کی وجہ سے ملک کو سیاسی



اور معاشی استحکام ملا۔ پرویز مشرف کے گرد جو سیاسی عناصر اکٹھے ہوئے ہیں وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت سے محروم ہیں؛ انہیں فوجی اقتدار کی بیساکھیوں کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ نواز شریف اور بے نظیر کی واپسی سے خائف ہیں اور پرویز مشرف کی وردی کے بغیر نواز شریف اور بے نظیر کو باہر رکھنا انہیں ممکن نظر نہیں آتا۔ انہیں خوف ہے کہ جب پرویز مشرف اپنا فوجی عہدہ چھوڑ دیں گے اور ملک میں آئین بحال ہو جائے گا، عدالتیں کام کرنے لگیں گی، سیاسی جماعتیں مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گی تو فوج کی چھتری کے ذریعے حاصل شدہ تحفظ باقی نہیں رہے گا اور ان کی شامت آ جائے گی۔ اس لیے یہ پرویز مشرف کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں اور ان کی ناجائز اور غیر آئینی حکومت کو قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے ہر ذلت قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔

### امریکہ کے جمہوریت پسندی کے دعوے کی حقیقت:

امریکی حکومت اپنے وقتی مصالح کی خاطر نہایت ڈھٹائی سے اپنی جمہوریت پسندی کے دعووں کے مذاق اڑا رہی ہے۔ منافقت اور دہرے معیار کا جو مظاہرہ امریکی کارپردازان پرویز مشرف کی فوجی آمریت کو برقرار رکھنے کے لیے کر رہے ہیں، اس سے امریکہ کی خود غرضی کھل کر سامنے آ گئی ہے اور اس کے چہرے سے منافقت کا نقاب مکمل طور پر اتر گیا ہے۔

عالمی طاقت کی حیثیت سے روس کی پسپائی کے بعد امریکہ ایک ایسے عالمی نظام (New World Order) کا علم بردار بن گیا ہے جس کی قیادت وہ چاہتا ہے کہ مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں ہو، وہ پوری دنیا کے سیاہ و سفید کا مالک ہو، تمام اقوام اس کے تابع ہوں، اقوام متحدہ کا ادارہ اس کی لونڈی ہو اور مغربی ممالک کے ساتھ مل کر وہ باقی دنیا پر سیاسی، معاشی، ثقافتی، تعلیمی اور معاشرتی ہمہ گیر غلبہ حاصل کر لے۔ اس ہمہ گیر غلبے کی خاطر وہ ہر

حرے کو استعمال میں لانا اپنا حق سمجھتا ہے۔ کسی طرف سے امریکہ کو کوئی خطرہ محسوس ہو تو اس کے تدارک کے لیے وہ پیشگی حملے (Pre-emptive attack) کو وہ اپنے لیے جائز سمجھتا ہے۔

### لادین نظام تعلیم کے نفاذ کی کوششیں:

مسلمان ممالک میں لادین نظام رائج کرنا اور اس کے لیے مسلمان ممالک کے نصابِ تعلیم سے قرآن و سنت کی تعلیمات کو خارج کرنا امریکہ کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پاکستان میں پرنس کریم آغا خان کو ذریعہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تعلیم کی عالم گیریت (Globalisation of Education) پر بھارت میں کریم آغا خان کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے دہلی کا اخبار ”دعوت“ رقم طراز ہے:

”گزشتہ دنوں بین الاقوامی شہرت یافتہ آغا خان فاؤنڈیشن کے سربراہ کریم آغا خان ہندوستان کے دورے پر آئے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ اسماعیلی خوجہ فرقہ کے روحانی پیشوا ہیں مگر دلچسپ امر یہ ہے کہ ان کا مولد و مسکن ہندوستان یا ایران نہیں ہے اور نہ مشرق کی کوئی سرزمین اور نہ ارضی ان کی جائے رہائش و پیدائش ہے بلکہ دور دراز علاقے یعنی دیارِ مغرب کا ایک نہایت اہم حصہ فرانس ان کا مرکز و محور ہے۔ یہ امر اس سے کہیں زیادہ دلچسپی کا باعث ہے کہ وہ رہتے تو فرانس یعنی مغرب میں ہیں مگر ان کا دل مشرقیوں کے لیے دھڑکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کی بیشتر معلوم سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز یہی خطہ ہے۔ ان کی معلوم سرگرمیاں، دلچسپیاں اور فنون لطیفہ آرٹ، کلچر اور تعلیم سے وابستہ رہی ہیں۔ وہ برصغیر کو اپنی کرم فرمائیوں سے اکثر

نوازتے رہتے ہیں اور خاص خاص موقعوں پر نہایت خاص مقاصد کے تحت ادھر کا رخ کرتے ہیں اور جب بھی یہاں آتے ہیں ان کی زبردست پذیرائی ہوتی ہے۔ سرکاری طور پر ان کا استقبال کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ٹھیک وہی سلوک کیا جاتا ہے جو کسی سربراہ مملکت کے ساتھ ہوتا ہے۔ گویا حکومت ہند اور اس خطے کی دوسری حکومتوں کو ان کے مقام و مرتبے کا پورا پورا ادراک ہے۔ وہ ان کے مقاصد اور مشن سے بھی آگاہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس بار بھی جب وہ یہاں پہنچے تو ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ وہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے خاص مہمان رہے اور ان کے ساتھ مختلف امور پر تبادلہ خیال کیا۔ انھیں آغا خان فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کے میدانوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کی تنظیم سماجی، تعلیمی اور حفظانِ صحت کے میدانوں میں کام کر رہی ہے اور اب وہ اپنا دائرہ کار بڑھانا چاہتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آغا خان فاؤنڈیشن فی الحال گجرات اور مہاراشٹر میں سرگرم عمل تھا مگر اب وہ مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ کے قبائلی علاقوں پر خصوصی توجہ دینا چاہتا ہے۔ اسی طرح فاؤنڈیشن نے تعلیم نسواں کو بھی اپنی توجہ کا خصوصی ہدف بنایا ہے۔ انہوں نے روزنامہ ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے کو دیے گئے انٹرویو میں اپنے اہداف و مقاصد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پوری دنیا میں جس طرح بنیاد پرستی کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے وہ ان کی تشویش کا ایک مرکز ہے اور وہ چاہتے ہیں یہ سختی اور مزاج کی



ناہمواری دور ہو۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم کو عام کرنے سے یہ چیز ختم کی جاسکتی ہے۔ علم ایک ایسا ہتھیار ہے جو کبھی ضائع نہیں ہوتا، ناگہانی آفتوں میں بھی یہ بڑا سہارا بنتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہی ان کی اور ان کے فرقے کی اصل قوت ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ تعلیم کو آج کے تقاضوں یعنی عصری تقاضوں کا جس طرح ساتھ دینا چاہیے تھا، ہندوستان میں اس کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

گلوبلائزیشن کا کاعمل جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں جاری ہے اور وہاں جس رفتار کے ساتھ وہ آگے بڑھ رہا ہے تعلیم کے میدان میں بالخصوص ہندوستان میں وہ چیز مفقود ہے، گویا ان کے مطابق جس طرح معاشی میدان میں گلوبلائزیشن کے اصول کو اپنایا گیا ہے اور دوسرے میدانوں میں جس طرح اس کو تسلیم کر لیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح تعلیم کے میدان میں بھی اس اصول کو نہ صرف متعارف کرانے کی ضرورت ہے بلکہ اس پر قدم آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ان کے مطابق اس کے بغیر دنیا کا اور خاص طور پر ترقی یافتہ دنیا کا مقابلہ ناممکن ہے۔ اگر ہندوستان اور اس جیسے دوسرے کمزور اور پسماندہ ملکوں کو ترقی کرنی ہے تو انھیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا۔ انھوں نے ایک نہایت اہم پیغام یہ بھی دیا ہے کہ روح عصر کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور ان کے مطابق روح عصر یہ ہے کہ ایک عالمی آفاقی انسانی برادری جنم لے رہی ہے جس کا منبع نظم

وانصرام ایک دستور ہوگا یعنی یہ عالمی و آفاقی اور انسانی برادری ایک دستور کے ماتحت ہوگی اس میں جغرافیائی حالات اور مختلف قبائلی و نسلی تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اب یہ ایک حقیقت بن چکی ہے اس کا جتنا جلد ادراک کر لیا جائے دنیا کے لیے اتنا بہتر ہے۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب قومی ریاستوں (Nation States) کا دور قصہ پارینہ ہو گیا اب عالمی حکومت ایک حقیقت بن چکی ہے کوئی مانے یا نہ مانے یہ ہو کر رہنا ہے اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے اور اس کا ساتھ دیا جائے تو تصادم اور تخریب سے بچا جاسکتا ہے۔“

(سہ روزہ دعوت دہلی یکم دسمبر ۲۰۰۴ء)

### پاک بھارت مشترکہ تعلیمی نصاب:

جنرل پرویز مشرف ایک بھارتی نشریاتی ادارے کو انٹرویو دیتے ہوئے پہلے پاکستان اور بھارت کے مشترکہ تعلیمی نصاب کی پیشکش کر چکے ہیں۔ پاکستان کے لاکھوں طلبہ پہلے ہی او (O) اور (A) لیول کے امتحان دے رہے ہیں اور اس طرح اپنے قومی نصاب کی پابندی سے آزاد ہو چکے ہیں۔ جو رہی سہی کسر باقی ہے اسے آغا خان بورڈ کے ذریعے پورا کرنے کے ارادے ہیں۔ مغرب اور امریکہ پاکستان کے تعلیمی نصاب اور دینی مدارس میں اسلامی نظام تعلیم کو دہشت گردی کی جڑ سمجھتے ہیں۔ وہ اس نظام کو ختم یا تبدیل کرنا چاہتے ہیں مگر یہ ان کی خام خیالی ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے سے شہادت اور جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت کو خارج کرنا ممکن نہیں ہے۔ واشنگٹن ٹائمز میں ایک امریکی دانشور اور اپنے ایک مضمون میں صراحت کے ساتھ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے دہشت گردی کی جڑ خود قرآن کریم کی تعلیمات ہیں اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ایک دہشت گرد اور انتہا پسند اقلیت نے مسلمانوں

اور اسلام کو یرغمال بنا رکھا ہے بلکہ اصل مسئلہ خود قرآنی تعلیمات کا پیدا کردہ ہے۔ لہذا مسئلے کا حل یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیمات کو تبدیل کرنے پر اعتدال پسند مسلمانوں کو آمادہ کیا جائے۔ اس طرح کے دانشوروں کے زیر اثر امریکی حکومت ایک طرف مسلمان ممالک میں پرویز مشرف جیسے حکمرانوں کی پشت پناہی کر رہی ہے جو ”اعتدال پسند روشن خیال“ (Enlightened Moderation) کے نام پر اسلام کی بنیادی تعلیمات کو تبدیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور ساتھ ہی نظام تعلیم کو تبدیل کرنے کے لیے N.G.Os (غیر سرکاری اداروں) پر بے دریغ روپیہ خرچ کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کثیر القومی تجارتی کمپنیوں کی وسیع افرادی قوت اور ڈھانچہ اور ان کے وسائل بھی استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ بھی انھی بین الاقوامی تجارتی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہیں جو دن رات اشتہارات کے ذریعے اسلامی ثقافت کو تبدیل کرنے اور مغربی اور ہندو انہ ثقافت کو ترویج دینے کا شیطانی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

مغربی اقدار کا فروغ اور تعلیمی نظام میں تبدیلی:

امریکہ کے مشہور تھنک ٹینک بروکنگز کے دانشور اسٹیفن کوہن اپنی زیر طبع کتاب The Idea of Pakistan میں لکھتے ہیں کہ پاکستان طویل عرصے سے امریکہ کا مخالف (adversary) ہے جبکہ امریکہ کو اپنے فوری مقاصد حاصل کرنے کے لیے اس کے تعاون کی ضرورت ہے۔ طویل عرصے کے مد مقابل اور مخالف ہونے کی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ پاکستان ایٹمی توانائی کا مالک ہے اور اس کی یہ صلاحیت امریکی عزائم اور علاقے میں اس کے مفادات کے لیے کسی وقت خطرہ بن سکتی ہے جبکہ دوسری وجہ اسلامی نظریے سے پاکستان کی وابستگی ہے۔ لہذا اسٹیشن کوہن تجویز پیش کرتا ہے کہ لمبے عرصے کے خطرات سے بچنے کے لیے امریکہ یہ حکمت عملی اختیار کرے کہ مختصر عرصے میں پاکستان کو جو



امداد دینا ضروری ہو وہ امداد اس شرط کے ساتھ مشروط ہو کہ پاکستان اپنا نظام تعلیم و تربیت مغربی اقدار کے مطابق کر دے اور اس سے قرآن و سنت پر مبنی تعلیمات نکال دے اور اپنے ایٹمی پروگرام کو Roll back (پلیٹ) کر دے۔

ایک یورپی ادارے (International Crisis (DCMG Management Group نے قرآن و سنت پر مبنی تعلیمات کو نفرت انگیز مواد (Hatred material) قرار دیا ہے اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ اپنے نصاب تعلیم سے اس مواد کو خارج کر دے۔ ہیلری کلنٹن نے سینٹ کی ایک کمیٹی کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پرویز مشرف اپنے ملک کے نظام تعلیم کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اور دینی مدارس کو مکمل طور پر حکومت کی تحویل میں لے کر اس کے نصاب کو جدید خطوط پر ترتیب دینے کے لیے تیار ہے لیکن اس کے لیے وہ ایک سولین ڈالر کی رقم کو قطعی ناکافی سمجھتا ہے۔ جس کی پیشکش اس وقت حکومت امریکہ نے کر رکھی ہے۔ ہیلری کلنٹن نے سفارش کی ہے کہ اس مقصد کی خاطر حکومت پاکستان کو کم از کم پانچ سولین ڈالر کی امداد دی جائے۔

### ملکی عدم استحکام:

درج بالا گزارشات سے مقصود یہ ہے کہ قارئین کے سامنے حالات کا وہ رخ پیش کر دیا جائے جن کا اس وقت عالم اسلام اور پاکستان کو سامنا ہے۔ پرویز مشرف کی آمرانہ روش جہاں پاکستان کے داخلی حالات کے پیش نظر خطرناک ہے وہاں امریکہ اور اس کے نظام کا اتحادی ہونے کی وجہ سے ہماری آزادی و خود مختاری اور ہمارے قومی و ملی تشخص اور اسلامی نظریاتی بنیاد کے لیے بھی ایک خطرہ ہے۔ اس وقت پرویز مشرف کی پالیسیوں کی وجہ سے امریکہ کی جنگ ہمارے ملک کے اندر تک پہنچ گئی ہے۔ وزیرستان میں قبائل اور فوج میں

آویزش ہے جبکہ دوسرے قبائلی علاقوں میں بھی فوج پہنچ گئی ہے اور شدید خطرہ ہے کہ فوج اور قبائل کی یہ آویزش پورے قبائلی علاقے میں پھیل جائے۔ اس کے لیے بہانہ یہ بنایا جا رہا ہے کہ القاعدہ کے مجاہدین قبائلی علاقے میں پناہ لیے ہوئے ہیں اور اگر پاکستانی فوج ان کا صفایا نہیں کرے گی تو امریکی افواج کی براہ راست مداخلت کا خطرہ ہے۔ امریکی افواج کی مداخلت کو روکنے کے لیے اپنے عوام کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کی منطق کو کوئی بھی جراتمند محبت وطن فرد قبول نہیں کر سکتا۔

پرویز مشرف صاحب نے بلوچ قبائل کو جس لہجے میں دھمکی دی ہے وہ لہجہ دشمن ملک کے لیے تو مناسب ہو سکتا ہے لیکن اپنے ہی ملک کے کسی گروہ کے لیے چاہے وہ کتنا ہی منحرف ہو چکا ہو یہ لہجہ استعمال کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ داخلی مسائل ہمیشہ سیاسی گفت و شنید اور لچکدار رویے سے حل کیے جاتے ہیں لیکن فوجی آمر اس سیاسی دانش سے محروم ہوتا ہے۔ بلوچستان کے بعض سرداروں کو حکومت کے بدعنوان کارپردازوں نے جو چھوٹ دے رکھی ہے اور قبائل کے عام افراد کو جس طرح ان کے رحم و کرم پر دے دیا گیا ہے اس کے نتیجے میں بلوچ قبائل میں ایک مستحکم اور پائیدار جمہوری کلچر کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ یہی حال صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کا ہے۔ اس کے نتیجے میں جو لاوا پک رہا ہے وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ فوجی آمریت کے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔

### تحریک آزادی کشمیر کو درپیش خطرات:

کشمیر کے مسئلے پر بھارت کے ساتھ ہنی مون ختم ہونے کے قریب ہے۔ اعتماد بحال کرنے کے اقدامات (CBM) کے حوالے سے جو مذاکرات شروع کیے گئے تھے، بگلیہار ڈیم کے مذاکرات ناکام ہونے سے ان کی حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ بھارت یہ کہنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے کہ ریاست جموں و کشمیر ایک متنازع علاقہ ہے۔ وہ اب تک اسی پرانی

رٹ پر قائم ہے کہ پوری ریاست بشمول شمالی علاقہ جات اور آزاد کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ پرویز مشرف صاحب امریکا کے ساتھ اپنے خصوصی تعلقات کے زعم میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انھوں نے کشمیر کے ٹکڑے کر دینے کی ایک متبادل تجویز پیش کر دی جبکہ بھارت اپنے اٹوٹ انگ کے موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا۔

کشمیر پر پاکستان کے موقف کی ایک تاریخ ہے اور اس موقف کی مستحکم بنیاد اقوام متحدہ کی قراردادیں ہیں۔ تقسیم ہند کے نامکمل حصے کے طور پر جب تک اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت یہ تنازع حل نہیں ہو پاتا، اس وقت تک یہ ایجنڈا نامکمل ہے۔ اس قانونی بنیاد کے بغیر بھارت اسے علیحدگی پسندوں کی ایک تحریک قرار دے گا اور بھارت میں اس طرح کی بیس سے زیادہ تحریکیں موجود ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ ان تحریکوں سے کلی طور پر الگ نوعیت کا ہے۔ کشمیر کبھی بھی بھارت کا حصہ نہیں تھا۔ بھارت کا قبضہ ظالمانہ ناجائز اور غیر اخلاقی ہے اور اس کے خلاف کشمیریوں کی آزادی کی جدوجہد ایک جائز جدوجہد ہے اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق دنیا کی تمام آزادی پسند اقوام کا فرض ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں کشمیریوں کا ساتھ دیں۔ اگر اقوام عالم اس مسئلے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ ایک تو بھارت کے ساتھ ان کے تجارتی اور سیاسی مفادات کی وابستگی ہے اور دوسری وجہ خود پاکستان کے حکمرانوں کی سفارتی اور اخلاقی کمزوری ہے۔

پاکستان کی بد قسمتی ہے کہ ابتدا سے یہاں اکثر حکومتوں نے اپنے ملک کے عوام کی آزادیوں اور حقوق کو چھیننے اور دبانے کی کوشش کی ہے۔ پرویز مشرف کی حکومت غیر جمہوری اور غیر آئینی حکومتوں کے تسلسل کا حصہ ہے۔ اس طرح کی حکومتوں میں اخلاقی جرات کا فقدان ہوتا ہے جس حکومت نے خود اپنے عوام کے حقوق غصب کر رکھے ہوں وہ کسی دوسرے ملک کی بے انصافیوں اور غاصبانہ قبضے کے خلاف کیونکر آواز اٹھا سکتی ہے۔



حکومت پاکستان بھارت کے خلاف عالمی سطح پر ایک موثر سفارتی مہم چلانے میں اسی وجہ سے ناکام رہی ہے کہ اس نے اپنے ہاں شہری آزادیاں سلب کر رکھی ہیں۔

### فوج کو متنازع بنانے کی پالیسی:

اس وقت پاکستان کو ان مخدوش حالات سے نکالنے اور اسے ایک مستحکم سیاسی اور معاشی بنیاد فراہم کرنے کی ذمہ داری پاکستان کے عوام پر آ پڑی ہے۔ پرویز مشرف نے فوج کے ادارے کو سیاست میں بری طرح ملوث کر دیا ہے۔ جو ادارہ سیاست میں اس قدر دھنس جائے اس میں اختلافات پیدا ہونا ایک طبعی امر ہے۔ قومی سلامتی کونسل کے ادارے کی مخالفت خود ایس ایم ظفر نے کی ہے جو ایم ایم اے کے ساتھ مذاکرات میں حکومت کے قانونی مشیر تھے۔ انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس ادارے میں حزب اختلاف اور حزب اقتدار کے لیڈر آمنے سامنے بیٹھے ہوں اور افواج پاکستان کے سرکردہ سربراہ بھی ان کے ساتھ ہوں تو اس ادارے میں ان کا ایک طرف جھکاؤ اور اختلاف رائے ایک بدیہی امر ہے۔

جنرل پرویز مشرف کی وجہ سے عوام میں فوجی ادارے کے بارے میں بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور عوام سمجھتے ہیں کہ فوجی حکومت ملٹی اور قومی امراض کا مداوا نہیں کر سکتی۔ پرویز مشرف کے خلاف تحریک صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ عوام کی طرف سے فوجی ادارے کو سیاسی ادارے کے طور پر مسترد کرنے کی تحریک ہے۔ پرویز مشرف کے بعد کسی اور جرنیل کی مداخلت بھی برداشت نہیں کی جائے گی۔

### موجودہ تحریک کے مراحل:

حالیہ تحریک کے پہلے مرحلے میں ہم نے عوام کو یہ ہدف دیا ہے کہ ملکی سیاست سے فوج کو فارغ کرنے کا عزم کر لیں۔ سیاسی جماعتوں کے اندر بھی پہلے ہی سے ایک ضابطہ اخلاق

پرا اتفاق ہونا لازمی ہے کہ آئین کی مکمل پاسداری کا عہد کریں نہ خود آئین کے کسی بنیادی کلیے کو توڑنے کی کوشش کریں اور نہ فوج کو یہ موقع دیں کہ وہ سیاسی جماعتوں کے اختلافات اور بدعنوانیوں کو بہانہ بنا کر آئینی ضابطوں کو معطل کر سکیں۔ ماضی میں سول حکومتوں کی ناکامی اور ان کے خلاف عوامی تحریکوں کا سبب یہی تھا کہ انہوں نے آئینی ضابطوں کو پامال کیا اور مطلق العنان حکومتیں قائم کرنے کی کوشش کی۔ ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف صاحب کے خلاف اس لیے تحریکیں اُٹھیں کہ انہوں نے اسی شاخ کو کاٹ ڈالا تھا جس پر وہ خود بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسی حکومتیں جمہور کی طاقت اور رائے عامہ کی قوت سے چلتی ہیں۔ جب وہ عوامی امنگوں کو نظر انداز کر کے قانون اور آئین کا مذاق اڑانے لگیں تو فوج کے طالع آزمایا، خود غرض اور بڑی طاقتوں کے آلہ کار جرنیل اس موقع کو غنیمت جان کر قومی وسائل کو خوانِ یغما سمجھ کر اس پر پل پڑتے ہیں۔

مستقبل میں کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ ہم کس حد تک عوام کو ایک مخلص قیادت کے گرد جمع کر سکتے ہیں اور کسی حد تک انہیں آخری منزل تک متحرک رکھنے کا ولولہ دے سکتے ہیں۔ ماضی میں تحریک چلانے والے قائدین کی نظر بھی آخری منزل کی بجائے موجود حکمران سے نجات حاصل کرنے تک محدود رہی، اس لیے عوام نے ایوب خان کے خلاف تحریک چلائی تو یحییٰ خان کے اقتدار سنبھالنے پر ختم کر دی۔ قومی اتحاد نے بھٹو صاحب کی جگہ ضیاء الحق کو قبول کر لیا اور بے نظیر اور نواز شریف کے بعد وہ پرویز مشرف کے جھانسنے میں آ گئے۔ موجودہ تحریک اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک ایک مذہبی، جمہوری، شائستہ اور آئین کی پابند اور عدالتوں کا احترام کرنے والی اسلامی جمہوری حکومت قائم نہ ہو جائے۔

تحریک ہمیشہ مختلف مراحل سے گزر کر زور پکڑتی ہے۔ پہلے مرحلے میں قیادت یکسوئی

کے ساتھ اہداف متعین کر کے عوام کو متحرک کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ عوام کو ایک واضح پروگرام دے کر پکارتی ہے۔ قیادت کی پکار پر متعلقہ سیاسی اور دینی جماعتوں کے کارکن لبیک کہتے ہیں۔ کارکن اپنی قیادت کی رہنمائی میں قربانی دیتے ہیں اور پھر عوام میدان میں نکلتے ہیں۔ اس وقت ہم اس تحریک کے دوسرے مرحلے میں ہیں۔ مجلس عمل کے کارکن اپنی قیادت کی پکار پر میدان میں ہیں۔ حج اور عید کے بعد ان شاء اللہ قیادت اور کارکنوں کے ساتھ ہی عوام کا جم غفیر بھی پرویز مشرف کی غیر آئینی اور بلا جواز حکومت کے خلاف میدان میں آئے گا۔ لوگ پرویز مشرف کی امریکہ نواز پالیسیوں کے خلاف ہیں۔

عراق اور افغانستان میں امریکہ جو مظالم ڈھا رہا ہے اور اس نے مسلمان عوام کو نئے سرے سے سرمایہ دارانہ نظام کے چنگل میں جکڑنے کے لیے جال پھیلایا ہے، عوام پرویز مشرف کی ایسی حکومت کو قبول کرنے کے حق میں نہیں ہیں جو ملک کو امریکہ کا طفیلی لادین ملک بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ عوام میڈیا کے ذریعے فحاشی اور عریانی کی تحریک کی مذمت کرتے ہیں۔ جس طرح سکولوں اور کالجوں میں مخلوط معاشرے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور جس طرح ہمارے خاندانی نظام اور ہمارے معاشرتی اقدار کو پامال کیا جا رہا ہے، عوام اس سے اظہارِ بیزاری اور نفرت کرتے ہیں۔ پرویز مشرف اور اس کے نامزد وزیراعظم کے دعوؤں کے علی الرغم ملک کے عوام غربت اور مہنگائی کی چکی میں پس رہے ہیں، تجارتی خسارہ بڑھ رہا ہے، ملک میں ہر سو بد امنی، ڈاکا زنی اور افراتفری ہے اور عوام اس صورتِ حال کے خلاف کسی بڑی تحریک کے انتظار میں ہیں۔

### متحدہ حزب اختلاف:

حزب مخالف کی سیاسی جماعتیں بھی باہمی اتحاد کے لیے مشترک بنیادوں کی تلاش میں ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ۱۹۷۳ء کا



دستور اپوزیشن جماعتوں کو مشترک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور بعض دوسری جماعتیں مطالبہ کر رہی ہیں کہ مجلس عمل سترہویں آئینی ترمیم سے اعلانِ بیزاری کر دے لیکن چونکہ سترہویں آئینی ترمیم کا تقاضا پورا کرنے سے خود پرویز مشرف نے راہ فرار اختیار کی ہے اور عملاً اس دستوری عہد کے ایک حصے کو من مانے طور پر منسوخ کر دیا ہے اس لیے مجلس عمل کو بھی قانوناً اور اخلاقاً سترہویں ترمیم سے اعلانِ بیزاری کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔

اس وقت حزبِ مخالف کی جماعتیں اس بات پر متفق ہیں کہ پرویز مشرف کی حکومت ناجائز، غیر آئینی اور غیر قانونی ہے اور اس کا کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے۔ اس کی جگہ کیا ہونا چاہیے؟ ایک منتخب اور جائز حکومت کے قیام کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کرنے کی ضرورت ہے؟ اس کے لیے عافیت کا راستہ تو یہی تھا کہ پرویز مشرف سترہویں ترمیم کو قبول کر کے اپنے عہد کا پاس کرتے اور فوج کی سربراہی سے دست بردار ہو کر جمہوریت کے راستے کی بڑی رکاوٹ دور کرتے، لیکن ان کو اللہ نے عزت کا یہ راستہ اختیار کرنے کی توفیق نہیں دی۔ اب عوام انھیں نہ صدر اور نہ ہی چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار ہیں بلکہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ دونوں عہدوں سے مستعفی ہو جائیں۔ آئین کے مطابق اس صورت میں عبوری سربراہ چیئر مین سینٹ ہوگا اور قومی اسمبلی کی اکثریتی پارٹی کا نمائندہ وزیراعظم ہوگا لیکن کیا موجودہ حکمران پارٹی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ پرویز مشرف کے بغیر اپنی یک جہتی کو برقرار رکھ سکے؟

### حکمرانوں کے لیے لمحہ فکریہ:

حزبِ مخالف کی جماعتیں اور خاص طور پر متحدہ مجلس عمل، حکمران جماعت کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اس امکان پر غور کرے اور اس سے قبل کہ عوامی سیلاب سب کچھ بہا لے

جائے وہ پرویز مشرف کو فارغ کرنے کے آئینی راستے کو قبول کرے۔ مجلس عمل کے ساتھ معاہدہ حکمران جماعت اور فوج کے اہم سرکردہ افراد نے کیا تھا اور پرویز مشرف کے ساتھ حکمران جماعت اور فوج کے تمام اہم سرکردہ عناصر سب بدعہدی کا شکار ہوئے ہیں۔ اس بدعہدی کے سبب قوم کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے عوامی جدوجہد کا وہی راستہ اختیار کرے جس کی تازہ ترین مثال یوکرائن کے عوام نے پیش کی ہے اور اس سے کچھ عرصہ قبل ارجنٹائن اور یوراگوئے میں جس کا تجربہ ہو چکا ہے۔

اس تحریک میں مسلمان خواتین کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ امریکی عالمی نظام کے تحت کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمان خواتین کو اسلامی قوانین کے خلاف اُکسایا جائے۔ مغربی تہذیب نے عورت کی جو گت بنائی ہے جس طرح اس کا لباس اُترا کر اس کو سُوا کیا گیا ہے اور جس طرح آزادی اور حقوق کے نام پر دھوکا دے کر اسے مردوں کے تفنن طبع اور جنسی ہوس کا ذریعہ بنایا گیا ہے وہ مسلمان خاتون سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ مسلمان خواتین ہماری تہذیب اور ہماری نئی نسل کے اخلاق و کردار کی محافظ ہیں۔ مسلمان خواتین میں قرآن کریم کی تعلیمات سے آگہی حاصل کرنے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی مجالس میں شرکت کا جو شوق آج پایا جاتا ہے یہ اسلامی تہذیب کے احیا کی بڑی علامتوں میں سے ہے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کا بڑا ذریعہ خاندانی نظام اور گھر کی حفاظت ہے اور خواتین کا جہاد یہی ہے کہ اسلامی معاشرے کے اس بنیادی قلعے کی حفاظت کے لیے اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں اور اس کے لیے قرآن کریم کی تعلیمات کو ذریعہ بنائیں۔

ملک اس وقت ایک نازک صورت حال سے دو چار ہے۔ غفلت اور لاپرواہی کی گنجائش نہیں۔ حکمرانوں کی حکمت عملی یہ ہے کہ لوگوں کو لہو و لعب میں مبتلا کر کے حقیقی مسائل

۶۵ ————— مضامین قاضی حسین احمد

سے غافل کر دیا جائے۔ وہ بھول جائیں کہ یہ ملک کتنی قربانیوں سے کن عظیم مقاصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ قوم غافل نہیں، بیدار ہے۔ اسے اپنے مقاصد کا شعور اور احساس ہے۔ وہ ان مقاصد کے لیے قربانیاں دینا جانتی ہے۔ وہ متحدہ مجلس عمل کی آواز پر لبیک کہے گی۔ مرد اور عورت سب اُنھیں گے اور ایک ایسی تحریک برپا ہوگی جس کے نتیجے میں ملک صحیح سمت میں سفر شروع کرے گا اور بالآخر اپنی حقیقی منزل کو پا لے گا۔ ان شاء اللہ!

(فروری ۲۰۰۵ء)



## اجتماعِ عام کا پیغام

یہ اجتماع اللہ کے کلمے کی سر بلندی کے لیے منعقد ہوا ہے۔ ہمیں یہ اجتماع پاکستان کے قلب لاہور میں مینارِ پاکستان پر منعقد کرنا تھا جہاں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تھی جس کے سامنے مسلمانوں کی عظمت کی نشانی بادشاہی مسجد ہے جہاں مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ کا مزار ہے۔ لاہور کو مولانا مودودیؒ نے اسلامی انقلاب کے لیے مرکز بنایا تھا۔ اس شہر لاہور کے باشندے ملک بھر سے آنے والوں کی میزبانی کے لیے بے چین و بے قرار تھے لیکن حکومت نے آخری دنوں میں ہمیں اجتماعِ عام منعقد کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ہم چاہتے تو اس کے باوجود بھی اجتماع کر سکتے تھے لیکن ہم نے تصادم کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کیا۔ حالانکہ حکومت نے یہی نقشہ بنایا تھا کہ ہم تصادم کے راستے پر چل پڑیں۔ اس طرح ہم نے حکومت کی اس سازش کو ناکام بنادیا اور فیصلہ کیا کہ اُس صوبے میں جہاں متحدہ مجلسِ عمل نے تاریخی کامیابی حاصل کی ہے اور جس نے جہادِ افغانستان میں اہم کردار ادا کیا ہے وہاں یہ اجتماع منعقد کریں۔

اجتماعِ عام کا مرکزی موضوع و جاہدِ وافی اللہ حق جہادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام کتابوں میں اور قرآن پاک میں بھی ہمارا نام مسلم رکھا ہے جو اللہ کا حکم ماننے اور اطاعت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ بس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہی ہمارے لیے کافی ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے جو شریعت نافذ کی وہ ہم سب کے سامنے

ہے۔ آپ اور صحابہ کرامؓ کی قربانیوں اور جدوجہد سے بھی ہم آگاہ ہیں۔ ہمارے لیے مکمل اور غالب دین چھوڑا گیا ہے۔ اس دین کے ہم امین ہیں۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اس دین کے نفاذ کے لیے کیا کوشش کی اور کیا قربانیاں دیں۔

ہمیں شہادت حق کا فریضہ انجام دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ یہ اُمت کا فریضہ ہے کہ وہ عدل و انصاف کی علم بردار بن کر اُٹھے۔ یہ اُمت دہشت گرد اُمت نہیں ہے، یہ عدل و انصاف اور امن و امان کی ضامن اُمت ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ آج (جمعہ یکم اکتوبر) کو سیالکوٹ کی ایک مسجد میں بم دھماکہ ہوا ہے اور ۲۰ سے زائد مسلمان شہید ہو گئے ہیں۔ یہ اسلام دشمن عناصر کی سازش ہے۔

آج فلسطین، افغانستان، عراق اور شیشان میں مسلمانوں کے خلاف ظلم کا بازار گرم ہے۔ ہمیں دشمنانِ اسلام کے خلاف متحد ہونا پڑے گا۔ لوگوں کو خیر کی طرف بلانا اور عدل و انصاف کا قیام ہم پر فرض ہے۔ یہ کام اکیلے نہیں متحد ہو کر کرنا ہوگا۔ جماعتِ اسلامی، اخوان المسلمون، علمائے کرام دینی جماعتیں اور تبلیغی جماعتیں اس فریضے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ پاکستان میں دینی جماعتوں نے متحدہ مجلسِ عمل بنائی ہے۔

جماعتِ اسلامی خالصتاً اور کلیتاً وہی دعوت لے کر اُٹھی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ ہم اس میں نہ کسی کمی بیشی کے مجاز ہیں نہ ہم نے اس میں کوئی کمی بیشی کی ہے۔ ہمارا اول و آخر حوالہ قرآن و سنت ہے۔ ہم لوگوں کو قرآن و سنت کی طرف بلاتے ہیں۔ دنیا کے مسلمان کسی ایک لیڈر پر نہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر متحد ہو سکتے ہیں اور متحد ہیں۔ یہ اجتماع عام اُمت مسلمہ کا اجتماع ہے۔ دینا بھر سے اسلامی تحریکوں کا گلدستہ بن گیا ہے۔ ہماری حقیقی زندگی اسلام ہے اور اسلام ایک ہی ہے، کوئی لبرل اور ماڈریٹ اسلام نہیں۔

رب العالمین کی طرف سے رحمت للعالمین جو پیغام لے کر آئے ہیں ہم اُس کے

داعی ہیں۔ اس پیغام کو بالآخر غالب آنا ہے۔ حق قوت اور روشنی عطا کرتا ہے، ہم پوری دنیا کو ایک بستی سمجھتے ہیں۔ ہمارے رسول پوری عالم انسانیت کے لیے آئے تھے۔ ہم سب آدم کی اولاد ہیں اور ہم سب میں عزت دار وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہو۔ عورتوں کے لیے بھی یہی پیغام ہے کہ وہ اللہ کے راستے پر چلیں اور حق وعدل کی علمبردار بنیں۔

جنرل مشرف امریکہ کو خوش کرنے کے لیے ماڈریٹ اسلام اور لبرل اسلام جیسی اصطلاحیں استعمال کر رہے ہیں۔ اسلام نے منکرات کو حرام قرار دیا ہے اور عریانی و فحاشی کا سختی سے مخالف ہے۔ اسلام میں فوجی آمریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جنرل مشرف اتاترک اور صدر بش جیسے لوگ اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔ آج مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ ۹۰ فیصد مسلم اکثریت والا کشمیر جب بھارتی فوج کے غاصبانہ قبضے کے خلاف جدوجہد کرتا ہے تو اسے دہشت گرد کہا جاتا ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے تو تسلیم کر لیا ہے کہ یہ بھی دہشت گردی ہے۔ اس طرح فلسطین میں یہودیوں کو بسایا گیا اور کہا گیا کہ یہ اسرائیل ہے اسے تسلیم کر لو اور جو تسلیم نہیں کرے گا وہ دہشت گرد ہے۔ شیشان، عراق، افغانستان میں ظلم و جبر کا بازار گرم ہے۔ یہ استعماری طاقتیں ہمارے گھروں میں گھس آئی ہیں اور ہمیں ہی دہشت گرد قرار دے رہی ہیں۔

میں یہ بات بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم پوری انسانیت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر امریکہ اسلام سے کوئی مکالمہ کرنا چاہتا ہے تو ہم سے مکالمہ کرے۔ جنرل مشرف اسلام اور عالم اسلام کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ انھوں نے ملک کے جمہوری و آئینی اداروں پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ ہم سول معاملات میں فوجی مداخلت کے خلاف ہیں۔ ہمارے نظام تعلیم کو سیکولر بنایا جا رہا ہے، دینی مدارس میں مداخلت کی جا رہی ہے، پاک فوج کو امریکہ کا کرائے کا پٹھو بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم نے تصادم کے بجائے مفاہمت کا راستہ



اپناتے ہوئے ۷ اویں آئینی ترمیم پر معاہدہ کیا جس کے مطابق قومی سلامتی کونسل کو آئین سے نکالا گیا اور صدر جنرل مشرف نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک وردی اتارنے کا وعدہ کیا لیکن اب ہمارے ساتھ دھوکا دہی کی جا رہی ہے جب کہ مجلس عمل نے کسی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ جنرل مشرف فریب دے رہے ہیں۔ یہ پاکستان کے ۱۴ کروڑ عوام کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ۳۱ دسمبر کے بعد جنرل مشرف کو ایک دن کے لیے بھی صدر نہیں مانیں گے۔ ہم انھیں دستور کی خلاف ورزیوں کا مرتکب اور دستور کو نظر انداز کر کے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کرنے والا قرار دیں گے۔ ملک کو بچانے کے لیے ہم ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

موجودہ حکمران امریکہ کو خوش کرنے کے لیے وزیرستان اور وانا کے عوام پر بمباری کرا رہے ہیں یہ سب کچھ فوج کے مورال کو نقصان پہنچانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اس میں بھارت، اسرائیل اور امریکہ سب کی سازش شامل ہے۔ قبائلی علاقوں میں کوئی القاعدہ نہیں وہ مقامی لوگ ہیں جنہیں نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ آپریشن ملک کے آزادی پسند عوام کے خلاف ہے۔ یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں بلکہ امریکہ کی دہشت گردی میں اس کا اتحادی بننا ہے۔ اسلام دہشت گرد نہیں ہے۔ قرآن کریم نے تو ایک انسان کے ناحق قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔ ہم نے ایٹم بم بنایا ہے لیکن یہ کسی مظلوم و معصوم پر گرانے کے لیے نہیں ہے۔ یہ تاریخ تو امریکہ کی ہے جس نے ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے تھے۔

امریکہ ہمارے پر امن ایٹمی پروگرام کو بند کرا رہا ہے۔ وہ کشمیر میں کنٹرول لائن کو مستقل سرحد کا درجہ دلا کر اس خطے میں بھارت کی اس طرح بالادستی چاہتا ہے جس طرح عرب ممالک میں اسرائیل کو بالادست بنا رہا ہے اور اب ہمارا حکمران اسرائیل کو بھی تسلیم

کرنے کا اشارہ دے رہا ہے۔ ہم فلسطین کی ایک انچ زمین پر بھی اسرائیل کے قبضے کو قبول نہیں کرتے اور نہ کشمیر کا سودا کرنے کی ہی کسی کو اجازت دیں گے۔

جنرل پرویز مشرف جو آمرانہ اقدامات کر رہے ہیں ان کے خاتمے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ میں اے آر ڈی والوں سے بھی کہتا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ مل جائیں۔ اگر وہ ۷۰ ویں ترمیم کے خلاف ہیں تو دستور میں تبدیلی آئینی طریقے سے ہی ہوگی، تاہم قراردادِ مقاصد، قادیانیوں کے خلاف دفعات، اسلامی اور حدود سے متعلق دفعات اور اسلامی نظریاتی کونسل کے ادارے پر سب متفق ہیں اور جن پر اتفاق نہیں ہے انھیں افہام و تفہیم سے آئینی طریقے سے طے کیا جاسکتا ہے۔ ہم ۷۰ ویں ترمیم پر کوئی معذرت نہیں کرتے۔ ہم نے اس کے ذریعے ملک کو جمہوریت کے راستے پر ڈال دیا اور صدر کووردی اتارنے کی ڈیڈ لائن طے کرائی۔ یہ ہماری کامیابی ہے۔ اے آر ڈی، مسلم لیگ (ن)، پیپلز پارٹی اور پونم سے ہم کہتے ہیں کہ اگر یہاں انصاف اور دستور کے مطابق حکومت چلانا ہے تو مل کر فیصلہ کر لیں کہ فوجی مداخلت قبول نہیں کریں گے۔ ہم تو فیصلہ کر چکے ہیں کہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد جنرل مشرف کووردی میں صدر نہیں رہنے دیں گے۔

(نومبر ۲۰۰۴ء)

## ملکی صورت حال — مسئلے کا حل

کیا حقیقی اقتدار موجودہ جمہوری اداروں کی طرف منتقل ہو جائے گا؟ کیا پرویز مشرف صاحب سترہویں ترمیمی بل کی منظوری کے بعد دستور کا تقاضے پورے کرتے ہوئے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ ۳۱ دسمبر کی آخری تاریخ سے قبل چھوڑ دیں گے یا کئی اقتدار سے چمٹے رہنے پر اصرار کریں گے؟ کیا پاکستان کو ایک دیانتدار اہل اور ملک و ملت کا حقیقی درد رکھنے والی قیادت میسر آ سکے گی؟ کیا امریکہ بھارت اور اسرائیل کی ملی بھگت کے مقابلے میں ہم اپنی قومی مصلحتوں کی حفاظت کرنے کے اہل ہیں؟ کیا ہم امریکہ کے ساتھ نتھی ہونے پر مجبور ہیں یا امریکہ سے جان چھڑا کر آزاد داخلہ اور خارجہ پالیسی اپنانے کے مواقع موجود ہیں؟

ہم کوشش کریں گے کہ ان اہم سوالات سے متعلق مسائل کے بارے میں اپنی پالیسی کی وضاحت کریں۔

برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد بظاہر تو اقتدار مسلم لیگ کی طرف منتقل ہوا لیکن قائد اعظم اور لیاقت علی خاں کی رحلت کے بعد مسلم لیگ کی تنظیمی کمزوری کی وجہ سے اقتدار کلی طور پر سول اور فوجی اسٹیبلشمنٹ (انتظامیہ) کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گیا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑی اور بالآخر یہ نوبت آئی کہ جنرل محمد ایوب خاں نے اسکندر مرزا کے ساتھ مل کر فوجی قبضے کے ذریعے سیاسی بساط ہی لپیٹ دی۔ ایوب خان کے



بعد یحییٰ خان اور یحییٰ خان کے بعد مشرقی پاکستان گنوا کے ذوالفقار علی بھٹو کو بھی فوج ہی نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنایا۔ ذوالفقار علی بھٹو سے اقتدار پھر جنرل ضیاء الحق کے ذریعے فوج کی طرف منتقل ہو گیا اور اسی فوجی دور حکومت میں نواز شریف کو متعارف کرایا گیا۔ بے نظیر اور نواز شریف کے تجربات کے بعد فوج نے پرویز مشرف کے ذریعے ایک بار پھر اقتدار براہ راست سنبھال لیا۔

اس طرح پاکستان کی پوری تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار کی حقیقی مالک پاکستان کی فوجی اور رسول انتظامیہ (Establishment) ہے جو وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً سیاستدانوں میں سے پسند کے کچھ لوگوں کو بھی شریک اقتدار کر لیتی ہے لیکن اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ حقیقی اقتدار عوام کے نمائندوں کی طرف منتقل ہو۔ موجودہ حکمران پارٹی بناتے وقت بھی اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ اس کی قیادت میں کوئی ایسا لیڈر سامنے نہ آ سکے جو فوجی قیادت سے آزاد ہو کر ملک و قوم کی رہنمائی کی اہلیت رکھتا ہو۔ چودھری شجاعت حسین علالت کی بنا پر اس قابل نہیں ہیں کہ ملک و قوم کی قیادت کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اسی لیے انھوں نے محض چند مہینے کی وزارت عظمیٰ پر بخوشی اکتفا کر لیا۔ اس سے قبل وہ اپنی علالت ہی کی وجہ سے میر ظفر اللہ خاں جمالی کی وزارت عظمیٰ پر رضامند ہو گئے تھے۔

شوکت عزیز صاحب بنیادی طور پر ایک ٹیکنوکریٹ ہیں۔ ساری زندگی ملک سے باہر گزاری ہے۔ ان کا سیاسی میدان کا تجربہ پرویز مشرف کے دور تک محدود ہے۔ وہ پہلی مرتبہ عام انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں اور جن حلقوں کو ان کے انتخاب لڑنے کے لیے پسند کیا گیا ہے۔ وہاں ان کی کامیابی کا انحصار جاگیرداروں اور وڈیروں کی حمایت پر ہے۔ یہ امر محل نظر ہے کہ کیا وہ پرویز مشرف کی سرپرستی کے بغیر بھی سیاسی قیادت کی اہلیت رکھتے ہیں۔

پرویز مشرف صاحب نے ایک منصوبے کے تحت مسلم لیگ (ق) کو کسی حقیقی عوامی اور سیاسی قیادت سے محروم رکھا ہے۔ مسلم لیگ (ق) کے اتحادیوں میں اگر ایک دو شخصیات ایسی ہیں بھی کہ وہ ذاتی لحاظ سے قیادت کی اہل ہیں تو وہ مسلم لیگ کو قابل قبول نہیں ہیں۔ البتہ چودھری شجاعت حسین صاحب علالت کے باوجود اپنی برادری کے اثرات و وسائل اور اپنے طویل سیاسی تجربے کی بنا پر اس بات کے اہل ضرور ہیں کہ اپنے کسی سیاسی حریف کو موجودہ اسمبلی میں اقتدار تک پہنچنے سے روک سکیں۔

ان حالات میں فوجی وردی اتارنے کے باوجود اقتدار پرویز مشرف کے پاس رہے گا۔ شوکت عزیز ان کی وفاداری اور اطاعت پر مجبور ہوں گے اور چودھری برادران دونوں کو سیاسی پشتیبانی مہیا کرتے رہیں گے۔ امریکی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے پرویز مشرف اور شوکت عزیز قومی مصلحتوں اور مفادات پر سودا بازی کرتے رہیں گے جس کے نتیجے میں عوام کی بے چینی بڑھے گی اور عوام کی طرف سے اپوزیشن پر خصوصاً ایم ایم اے پر پرویز مشرف حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے دباؤ بڑھے گا۔

ان حالات میں ملک کو کسی ہیبجانی صورت حال سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ مسائل کا آئینی اور قانونی حل نکالنے کے لیے اپوزیشن جماعتوں اور حکومتی گروہ میں مذاکرات کا سلسلہ جاری رہے۔ طرفین ایسا رویہ اختیار کرنے سے گریز کریں جس کے نتیجے میں تصادم ناگزیر ہو جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ پرویز مشرف صاحب خوش دلی سے آئین کا تقاضا پورا کرتے ہوئے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ چھوڑ دیں۔ اس سے فوج میں بھی اطمینان پیدا ہوگا اور پرویز مشرف صاحب کو بھی ان خطرات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جس کی شکایت انھوں نے خود اپنے ایک انٹرویو میں کی ہے کہ ان پر حملے میں فوج کے نچلی سطح کے کچھ لوگوں کا ہاتھ تھا۔ اس کے برعکس اگر آئین کی

کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ فوجی عہدہ برقرار رکھنے پر اصرار کریں گے تو تشدد کا راستہ اختیار کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ ۳۱ دسمبر کے بعد فوجی عہدہ برقرار رکھنا آئین کو پس پشت ڈال کر اپنے ہی قائم کردہ جمہوری نظام پر وار کرنے کے مترادف ہوگا جس کے بعد جمہوری قوتوں کے پاس پرویز مشرف کے خلاف ایچی ٹیشن کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہے گا۔ اس ایچی ٹیشن کا نتیجہ جو بھی نکلے لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ اس کے بعد پرویز مشرف صاحب کے لیے اقتدار پر قائم رہنا ممکن نہیں رہے گا اور ایوب خان اور یحییٰ خان کی طرح ان کے اپنے ہی ساتھی ان سے معذرت کر سکتے ہیں کہ ان کا یہ رویہ نہ قوم کے لیے قابل قبول ہے اور نہ ملک کے دوسرے اداروں کے لیے۔ چنانچہ ملک و قوم اور خود پرویز مشرف کے لیے عافیت کا راستہ یہی ہے کہ وہ وردی اُتار کر ایک سویلین صدر بننے پر اکتفا کر لیں۔ اگر شوکت عزیز وزیراعظم بن جائیں تو دونوں مل کر باہمی ہم آہنگی کے ساتھ ۲۰۰۷ء تک آئین کی حدود میں رہتے ہوئے حکومتی ذمہ داریاں ادا کرتے رہیں اور اپوزیشن جماعتیں ۲۰۰۷ء کے انتخابات کے لیے تیاری کریں۔

### قومی جذبات کا احترام:

اس صورت میں پرویز مشرف اور شوکت عزیز کی حکومت عافیت کے ساتھ اسی وقت چل سکتی ہے کہ وہ حساس معاملات میں قومی جذبات کا احترام کریں۔ حساس معاملات میں نیوکلیر پروگرام سب سے اہم ہے اور اس پر ملک و قوم کی سلامتی کا انحصار ہے۔ بھارت کے مقابلے میں اپنی آزادی اور خود مختاری کی حفاظت کے لیے ہمارا دار و مدار اسی صلاحیت پر ہے۔ یہ ملک و قوم اور ہماری فوج کے لیے بین الاقوامی برادری میں افتخار کا باعث ہے۔

امریکہ نے کھلم کھلا ہمیں ایک ایٹمی طاقت ماننے سے انکار کیا ہے۔ وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہے۔ ہماری اس صلاحیت کو اسرائیل



نے بھی اپنے لیے خطرہ قرار دیا ہے اور بین الاقوامی صہیونی لابی اس پروگرام کے خلاف سرگرم ہے۔ عبدالقدیر خان سمیت ہمارے بہت سے سائنس دانوں کو اس ایٹمی پروگرام کو پروان چڑھانے کے جرم میں اپنی ہی حکومت کے ہاتھوں ذلیل کرایا گیا ہے اور ایٹمی پھیلاؤ (Nuclear Proliferation) کا الزام لگا کر پاکستان کو بھی غیر ذمہ دار ملک قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایٹمی پروگرام پر دباؤ میں کمی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ پرویز مشرف کی وفاداری اور دہشت گردی کے خلاف امریکی اتحاد میں شامل ہونے کے باوجود اور اس امر کے باوجود کہ پاکستان کو نیٹو سے باہر امریکہ کا اہم اتحادی قرار دیا گیا ہے اس اتحادی پر اس وقت تک اعتماد نہیں کیا جائے گا جب تک کہ پرویز مشرف صاحب ایٹمی پروگرام کو امریکہ کے معائنے کے لیے کھول نہ دیں اور اس پر بین الاقوامی کنٹرول کو قبول نہ کر لیں لیکن پرویز مشرف صاحب ایٹمی پروگرام پر ایک حد سے زیادہ مفاہمت نہیں کر سکتے۔ اگر کشمیر یا ایٹمی پروگرام پر قومی پالیسی سے انحراف کیا جائے گا یا اسرائیل کو تسلیم کرنے، عراق اور افغانستان میں امریکی مفادات کے لیے اپنی فوجوں کو ملوث کرنے یا قبائلی علاقوں میں امریکی دباؤ کے تحت عریاں فوجی قوت استعمال کرنے کے قبیل کے اقدامات کیے جائیں گے تو حکومت کو اندرونی سیاسی ایجنڈیشن اور بڑی عوامی تحریک کا سامنا کرنا پڑے گا۔

امریکہ خارجہ پالیسی سے آگے بڑھ کر اب تعلیمی اور ثقافتی اور تہذیبی میدان میں بھی اپنی مرضی منوانے پر تلا ہوا ہے۔ پرویز مشرف کے مطلق العنان دور حکومت میں جب ابھی پارلیمنٹ وجود میں نہیں آتی تھی، زبیدہ جلال صاحبہ کی معرفت امریکی آشیر باد کے ساتھ اہم تعلیمی شعبوں میں آغا خان فاؤنڈیشن کو عمل دخل دینے کے لیے ایک معاہدہ کیا گیا تھا۔ اس معاہدے کے مطابق ۲۰۰۶ء میں ملک بھر میں ہر تعلیمی بورڈ سے الحاق کر لے۔ آغا خان فاؤنڈیشن کے بورڈ کو یو ایس ایڈ (U.S.Aid) کی مالی پشتیبانی حاصل ہوگی جس کی شہ پر وہ

خود سے منسلک اداروں کو بظاہر بہتر سہولتیں مہیا کر کے انھیں مغربی تہذیب و ثقافت اور اقتدار اپنانے اور بچوں کو اسلامی تہذیب سے نا آشنا کر کے مغربی تہذیب کا خوگر بنانے پر آمادہ کر سکے گا۔ اس طرح نظام تعلیم کو سیکولر بنانے اور نئی نسل کو اسلامی نظریے کے بجائے سیکولر نظریات کی طرف دھکیلنے کی امریکی پالیسی پر عمل درآمد کرنے کا پروگرام ہے۔

اس کا راستہ ہموار کرنے کے لیے ابھی سے پرویز مشرف صاحب اپنی تقریروں اور انٹرویوز میں اظہار خیال فرما رہے ہیں کہ اسلام سیکولر ازم کے ساتھ متصادم نہیں ہے۔ پرویز مشرف صاحب کے اعتدال پسند اسلام (Moderate Islam) کی تو یہ تو جیہہ کی جاسکتی ہے کہ خود قرآن کریم نے امت مسلمہ کو امت وسط (اعتدال والی قوم) قرار دیا ہے مگر ان کے اس ارشاد کی کوئی تو جیہہ ممکن نہیں ہے کہ اسلام میں سیکولر ازم کی گنجائش ہے کیونکہ سیکولر ازم نام ہی اجتماعی اور سیاسی زندگی سے دین کے اخراج کا ہے جبکہ اسلام مکمل نظام زندگی ہے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ ہے اور بقول اقبال دین دنیا کے دروازے کی کنجی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا ہے۔ ”از کلید دیں در دنیا کشاد“

اسلام کا مطالبہ ہے کہ اسے قبول کرنا ہے تو پورے کا پورا قبول کر لو۔ اسلام کے بعض حصوں کو قبول اور بعض کو رد کرنے کی کوئی گنجائش دین اسلام میں نہیں ہے۔

اَفْتَوْمُنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ  
ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلٰى اَشَدِّ  
الْعَذَابِ ط (البقرہ ۲: ۸۵)

”تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا

اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور

آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟“

حدود قوانین اور توہین رسالت کے قانون کو مغربی اقوام کے دباؤ کے تحت تبدیل

کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن پرویز مشرف صاحب پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ انھوں

نے پسپائی اختیار کی اور اسلام کے راستے کو چھوڑ کر اپنے نظام تعلیم اور تہذیب و ثقافت اور

قوانین کو مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگنے کے راستے پر چل پڑے تو وہ خود اپنے خلاف

احتجاج اور ایجنسی ٹیشن کو دعوت دیں گے۔

مغربی اقوام اور خصوصاً امریکہ کا ایک مطالبہ دینی مدارس کے آزادانہ نظام کو ختم کر کے

ان کو حکومتی کنٹرول میں دینا ہے۔ مغربی میڈیا میں دینی مدارس کے خلاف زبردست مہم

چلائی جا رہی ہے اور دینی مدارس کو دہشت گردی اور تشدد کا منبع قرار دیا جا رہا ہے۔ دہشت

گردی اور جہاد کو ہم معنی قرار دیا جا رہا ہے اور اس بہانے پر آئی تعلیمات کو نصاب تعلیم سے

خارج کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ یہ ایسا مطالبہ ہے کہ پاکستانی قوم کو اس کے لیے

آمادہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ جو حکومت بھی اس حد تک امریکہ کو خوش کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا

ہوگی اسے اپنی قوم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

امریکہ کے دباؤ کے تحت اس طرح کی پالیسی بنانے والی حکومت ملک کے امن و امان

کو تہ و بالا کرنے کی خود ذمہ دار ہوگی اور امن و امان کی خرابی کے ساتھ اقتصادی ترقی کا

خواب ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ اقتصادی ترقی کے لیے سیاسی استحکام اور امن و امان بنیادی

ضرورت ہے۔ آج دنیا میں ہزاروں ارب ڈالر اس انتظار میں ہیں کہ انھیں کسی ترقی پذیر

ملک میں امن و امان کی بہتر صورت حال اور سیاسی استحکام ملے تو یہ پورا سرمایہ وہاں منتقل کر

دیا جائے۔ خود پاکستانی شہری اپنا سرمایہ اور اپنی مہارت (Skill) اپنے ملک کی طرف اس



وقت منتقل کریں گے جب ان کو یقین ہوگا کہ ملک سیاسی طور پر مستحکم ہے اور امن وامان کی صورت حال بہتر ہے۔ یہ حالات اس وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب حکومت اور عوام میں ہم آہنگی ہو اور باہمی اعتماد کی فضا قائم ہو جو حکومت اپنے عوام کی خواہشات اور امنگوں کو نظر انداز کر کے طاقت کے استعمال کے ذریعے امن قائم کرنے پر تل جائے وہ امن کی بجائے بد امنی کو دعوت دے گی۔ چنانچہ وزیرستان میں طاقت کے استعمال کا نتیجہ حکومت نے دیکھ لیا۔ اب پاکستانی فوج اپنے آپ کو خود اپنی قوم میں اجنبی محسوس کر رہی ہے۔ چھاؤنیوں کے گرد دیواروں کو اونچا کیا جا رہا ہے اور فوجی افسران حفاظتی دستوں کی نگرانی کے بغیر اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ پرویز مشرف صاحب جس راستے سے گزرتے ہیں اس پورے راستے پر گاڑیوں کے چلنے پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے اور عملاً کرفیو کا سماں ہوتا ہے۔ یہ سب عوام کی مرضی کے خلاف پالیسیاں بنانے کے شاخسانے ہیں۔ ان حالات میں ملک نہ اقتصادی طور پر ترقی کر سکتا ہے نہ اس میں سیاسی استحکام پیدا ہو سکتا ہے نہ اس کی امن وامان کی صورت حال کو درست کیا جاسکتا ہے۔

### بہتری کے لیے اقدامات:

اب ہم اپنے سوالات کے اصل جواب کی طرف آتے ہیں۔ اگر پاکستان کی فوج یہاں کے سیاست دان اور قومی دانشور خلوص نیت کے ساتھ ملک و ملت کو موجودہ گمبھیر صورتحال سے نکالنا چاہتے ہیں تو درج ذیل اقدامات کے ذریعے قوم کی کشتی بھنور سے نکالی جاسکتی ہے:

۱- پرویز مشرف صاحب چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ چھوڑتے

ہوئے اسے فوج کے کسی مستحق اور اہل جنرل کے سپرد کر دیں جو سیاسی

عزائم کی بجائے قومی دفاع پر پوری توجہ مرکوز کر دے اور فوج کو ملک

کی اندرونی صورتحال میں فریق بنانے کی بجائے سیاست سے ہمیشہ کے لیے الگ کر دے۔

۲- نیوکلیر پروگرام کی حفاظت اور اسے ترقی دینے کی پالیسی پر سختی سے پابندی کا اعلان کیا جائے۔

۳- پارلیمنٹ کی خود مختاری کو تسلیم کر کے اقتدار اس کی طرف منتقل کر دیا جائے اور پارلیمنٹ سے بالاتر اداروں کا خاتمہ کر کے صدر اور سکیورٹی کونسل کے ادارے اور فوج سمیت تمام اداروں کو پارلیمنٹ کے ماتحت کر دیا جائے۔ اس بنیادی اصول کو قوم سیاست دان، حکومتی پارٹی اور اپوزیشن دل سے تسلیم کر لیں اور اس کا احترام کریں۔

۴- پرویز مشرف صاحب اور حکمران پارٹی کوئی ایسا اقدام کرنے سے گریز کریں جو ملک کے اسلامی نظریے کے منافی ہو، جس کو ملک کے عوام خوشدلی سے قبول کرنے سے انکاری ہوں اور جو قومی پالیسی اور قومی امنگوں کے منافی ہو۔

۵- کشمیر کی قومی پالیسی پر سختی سے کاربند رہیں اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے علاوہ کسی دوسرے حل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

۶- فلسطینیوں کے ساتھ یکجہتی کا اعلان و اقرار کیا جائے اور بیت المقدس سمیت فلسطین پر اسرائیل کی بالادستی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

۷- عراق اور افغانستان میں امریکی فوجی مداخلت کو ختم کر کے عراق اور

افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کو بحال کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ کسی بھی صورت پاکستانی فوج یا نمائندے عراق نہ بھیجے جائیں۔

- ۸- دینی مدارس میں ناجائز حکومتی مداخلت کا سلسلہ بند کیا جائے اور امریکی دباؤ کے تحت تعلیمی منہج کو تبدیل کرنے سے احتراز کیا جائے۔
- ۹- حدود قوانین اور توہین رسالت کے قوانین کو چھیڑنے سے احتراز کیا جائے۔

- ۱۰- آئندہ انتخابات کو آزادانہ اور منصفانہ بنانے کے لیے ایک آزاد اور خود مختار الیکشن کمیشن کا قیام عمل میں لایا جائے اور چیف الیکشن کمشنر کی تقرری اپوزیشن کے مشورے سے عمل میں لائی جائے۔ جس الیکشن کمیشن پر اپوزیشن عدم اعتماد کا اظہار کرے اسے تبدیل کر دیا جائے تاکہ انتقال اقتدار عوام کی آزاد مرضی سے عمل میں آئے اور عوام کا حق حکمرانی تسلیم کر لیا جائے۔

اگر حکومت ان تجاویز پر خوش دلی سے عمل کرنے پر آمادہ ہو جائے تو قدرتی طور پر اپوزیشن سے بھی مثبت رویے کی توقع کی جاسکتی ہے بلکہ وہ اقتصادی، اخلاقی اور سیاسی میدان میں ترقی کے کاموں میں حکومت سے تعاون کرے گی۔ اس صورت میں ملک و قوم کی کشتی نئے آنے والے طوفانی دور میں بحفاظت پار ہو سکتی ہے اور حکومت اور اپوزیشن کے درمیان تعاون کے راستے کھل سکتے ہیں۔ ملک کے ہر بھی خواہ کا فرض ہے کہ حکومت اور اپوزیشن دونوں کو عافیت کا یہ راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اثر و رسوخ استعمال کرے۔ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان اگر قومی مفاد پر مبنی اس پالیسی پر اتفاق ہو جائے تو



ہم بھارت، اسرائیل اور امریکی گٹھ جوڑ کے باوجود خطرات کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور قومی مصلحتوں کی حفاظت کی خاطر آزاد خارجہ اور داخلہ پالیسیاں بنا سکتے ہیں اور ملکی دفاع کی خاطر عوام، فوج اور حکومت کا مل اتفاق اور ہم آہنگی کے ساتھ ایک ساتھ چل سکتے ہیں۔ جمہوری طرز حکومت کا حسن یہی ہے کہ حکومت اور اپوزیشن قومی مفاد کی خاطر اکٹھی ہو جاتی ہیں اور قومی سلامتی کو درپیش خطرات کا مل کر مقابلہ کرتی ہیں۔

کسی بھی جمہوری معاشرے میں ہر پارٹی کا اصل ہدف اپنی قوم کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ قوم فلاح و بہبود کے لیے قومی سلامتی اولیں ضرورت ہے اور قومی سلامتی کی خاطر حکومت، فوج اور عوام میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ یہ ہم آہنگی اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ملک کے تمام ادارے صدق دل سے پاکستان کے آئین اور قرارداد مقاصد میں بیان کردہ بنیادی اصولوں کی پاسداری کریں۔ ان بنیادی اصولوں میں سب سے اہم ہمارا اسلامی نظریہ ہے۔ قومی اسمبلی اور سینٹ کے غیر مسلم ممبران سمیت ملک کے تمام اہم اداروں کے افراد پاکستان کے اسلامی نظریے کے ساتھ وفاداری کا حلف لیتے ہیں۔ دستور کی پابندی اور اس کی حفاظت کرنے کا حلف ہماری افواج کے سربراہان، ہمارے صدر، وزیر اعظم اور اعلیٰ عدالتوں کے تمام جج صاحبان لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود دستور کی پابندی نہ کرنے کے نتیجے میں ہمارا سیاسی نظام کئی بار تلیٹ ہو چکا ہے۔

ہماری افواج میں بھی اب یہ احساس پایا جاتا ہے کہ قومی سلامتی کے لیے اپنی تاریخ اور اسلامی نظریے سے وابستگی، مضبوط اقتصادی ڈھانچا اور مضبوط اداروں کا قیام ضروری ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب ہم دستور کی پابندی کا عہد کریں جس کی بنیاد نظریہ اسلام، جمہوریت، وفاقت اور عدلیہ کی آزادی پر رکھی گئی ہے۔

اس وقت پوری قوم میں اپنے مستقبل کے بارے میں جو فکر مندی پائی جاتی ہے اس

فکر مندی اور تشویش کو اُمید کی شمع روشن کر کے یقین محکم میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔  
 یاس اور حزن، مایوسی اور نا اُمیدی تمام برائیوں کی جڑ ہے اور یہ انسان کی قوتِ عمل کو مفلوج کر  
 دیتی ہے جبکہ اُمید اور یقین مضمحل قوتوں میں بھی جان ڈال دیتی ہے۔ اس لیے حضور نبی  
 کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔ یسروا ولا تعسروا ولا تنفروا، آسانیاں پیدا  
 کرو اور تنگیاں مت پیدا کرو، خوشخبریاں سناؤ اور لوگوں کو متنفر مت کرو۔

اللہ رب العالمین کا قرآن کریم میں تاکیدِ حکم ہے:

لا تقنطوا من رحمة الله

”اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو“

لا تيسسوا من روح الله

”اللہ کے رحم سے نا اُمید نہ ہوں“

لا تخافوا ولا تحزنوا

”نہ خوف کرو اور نہ غم کرو“۔

لا تخف۔ خوف مت کرو ولا تحزن غم مت کرو۔

یہی تعلیم ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال نے دی ہے۔ وہ اُمید کے شاعر تھے۔ یاس

اور حزن کو انہوں نے مثنوی اسرارِ خودی میں اُم الخبائث قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

(اگست ۲۰۰۴ء)

## پاکستان کو درپیش حقیقی خطرات

پاکستان کے مستقبل کا منظر اس وقت دھندلا گیا جب ستمبر ۲۰۰۱ء کی ایک رات جنرل پرویز مشرف نے امریکی صدر بش کو یقین دہانی کرا دی کہ پاکستان، انٹیلی جنس، لاجسٹک سپورٹ اور فضائی حدود کے آزادانہ استعمال کے ذریعے افغانستان کی طالبان حکومت کے خلاف امریکی جارحیت کے ساتھ ہے۔ پرویز مشرف نے اس طرح امریکہ کا فرنٹ لائن حلیف بننے کا اعلان کر دیا اور اس کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح انہوں نے پاکستان کو بچا لیا اور ”سب سے پہلے پاکستان“ کا نعرہ لگایا۔

ان سے سوال کیا گیا کہ اگر کل کشمیر کے مجاہدین کی حمایت ترک کرنے کے لیے اسی طرح کی دھمکی کا سامنا کرنا پڑے تو ان کا رول کیا ہوگا تو انہوں نے کہا کہ ”کشمیر ہمارا خون ہے ہم کسی طرح بھی کشمیری مجاہدین کی حمایت سے دست کش نہیں ہوں گے“ لیکن جو یوٹرن (U-turn) افغانستان پر امریکی حملے کے وقت لیا گیا تھا اس کے نتیجے کے طور پر حکومت پاکستان کشمیری مجاہدین کی جدوجہد کو بھی بالآخر ”سرحد پار دہشت گردی“ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی اور اب عملاً حکومت کشمیری مجاہدین کی حمایت سے دستبردار ہو گئی ہے۔ اس یوٹرن یا قلابازی کے نتیجے ہی میں اب حکومت پاکستان نے اپنے سائنس دانوں کی تذلیل کی ہے اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سب کچھ پاکستان کے ”بہترین مفاد“ اور ”سب سے پہلے



پاکستان کے حوالے سے کیا جا رہا ہے۔ جنرل پرویز مشرف صاحب نے پارلیمنٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے چار خطرات کی نشان دہی کی تھی:

- ۱- پاکستان پر الزام ہے کہ وہ افغانستان میں اتحادی فوجوں کی مزاحمت کرنے والوں یا القاعدہ کو پناہ دے رہا ہے۔
- ۲- پاکستان، ایران، لیبیا اور شمالی کوریا کو ایٹمی ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کا ذمہ دار ہے۔
- ۳- پاکستان، بھارت اور مقبوضہ کشمیر میں سرحد پار دہشت گردی کا مرکز ہے۔
- ۴- پاکستانی معاشرہ ایک انتہا پسند مذہبی معاشرہ ہے۔

جنرل پرویز مشرف اپنی پالیسیوں کے ذریعے دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ پاکستان افغانستان میں اتحادی فوجوں کا حلیف اور پشتی بان ہے اور یہ باور کرانے کے لیے وہ ان تمام عناصر کے خلاف فوجی آپریشن کرنے کے لیے تیار ہے جن پر افغانستان میں مزاحمت کی حمایت کا الزام ہے۔ ان میں وزیرستان اور مہمند کے قبائل اور پاکستان میں واقع دینی مدارس بھی شامل ہیں۔ اس طرح پرویز مشرف صاحب امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے محض ایک مبہم الزام کو رفع کرنے کی خاطر پاکستان کی فوج کو مغربی سرحد پر آباد قبائل اور پاکستان کے محب اسلام اور محب وطن عوام سے لڑانا چاہتے ہیں۔ اس سے امریکہ کا الزام تو رفع نہیں ہوگا لیکن پاکستان کے اندر انتشار پھیل جائے گا اور فوج اپنے فطری حلیفوں کی حریف بن جائے گی۔ یہ دشمن کا کھیل ہے جو پاکستان کی فوج کو عوام، قبائل اور دینی جماعتوں کی تائید سے محروم کر کے اس کے عزم و حوصلے اور مورال کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔

ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے بارے میں مبینہ طور پر حکومت پاکستان کو امریکی برطانوی جاسوسی اداروں اور انٹرنیشنل اٹامک انرجی اتھارٹی (IAEA) نے ثبوت فراہم کیے ہیں کہ لیبیا، ایران اور شمالی کوریا کو ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی میں پاکستان کا ہاتھ ہے۔ افغانستان پر حملہ

کرتے وقت بھی امریکہ نے الزام لگایا تھا کہ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن کے پینٹاگون کے حملوں میں افغانستان کی طالبان حکومت کا ہاتھ ہے۔ اسی طرح عراق پر حملے سے قبل امریکہ کا دعویٰ تھا کہ اس کے پاس ثبوت ہے کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں لیکن عراق کا چپہ چپہ چھان مارنے کے باوجود آج تک عراق میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے کیمیائی ہتھیاروں یا ایٹمی ہتھیاروں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا جس کی وجہ سے برطانوی حکومت اس وقت شدید تنقید کا سامنا کر رہی ہے اور برطانوی وزیراعظم مسٹر ٹونی بلیر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اگر ان کو یقین ہوتا کہ عراق میں تباہی پھیلانے والے ہتھیار موجود نہیں ہیں تو وہ عراق پر حملے کی حمایت نہ کرتے۔ خود صدر بش کو اس سلسلے میں غلط بیانی کرنے اور قوم اور کانگریس کو گمراہ کرنے کے الزام سے سابقہ درپیش ہے۔

جارحانہ عزائم رکھنے والی استعماری طاقتیں کمزور اقوام کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرنے سے پہلے ہمیشہ اُلٹے سیدھے بہانے تراشتی ہیں۔ پاکستان کے حکمران بالخصوص پرویز مشرف صاحب اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی کو حکومت پاکستان اور افواج پاکستان کی بجائے چند سائنس دانوں کی ذاتی حرص کا نتیجہ قرار دے کر بین الاقوامی نظروں میں سرخرو ہو جائیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ اسی کے نتیجے میں خود پاکستان کے انگریزی پریس میں افواج پاکستان اور حکومت پاکستان کے خلاف مہم شروع ہو گئی ہے اور یہ برملا کہا جا رہا ہے کہ سائنس دانوں کے لیے تنہا یہ کام کرنا ممکن نہیں تھا اور اگر محض سائنس دانوں نے یہ کام کیا ہے تو یہ پاکستان اور اس کے سلامتی کے نظام کی ناکامی کا ثبوت ہے۔ اس بنیاد پر خود پاکستان کو ایک غیر ذمہ دار ملک قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ ایٹمی ٹیکنالوجی جیسے حساس اداروں کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں ہے۔

پاکستان کے حکمرانوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ امریکہ نے اسے ایٹمی طاقت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا ہے اور وہ اسے نیوکلیر کلب کا ممبر نہیں بنائے گا۔ اسرائیل اور بھارت کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ اسرائیل کی حفاظت امریکی خارجہ پالیسی کا بنیادی ستون ہے۔ بھارت کو امریکہ نے اپنی حکمت عملیوں کا حلیف (Strategic Partner) قرار دیا ہے اور وہ اسے چین کی طاقت کو روکنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ پاکستان یہ یقین دہانیاں کر رہا ہے کہ اس کا ایٹمی ہتھیار خالصتاً دفاعی نوعیت کا ہے اور بھارت کے مقابلے کے لیے اگر اس کے پاس یہ دفاعی ہتھیار موجود نہ ہو تو طاقت کا توازن بگڑ جائے گا اور جنوبی ایشیا کا امن برقرار نہیں رہے گا۔ اس کے باوجود مغربی طاقتیں اسے ”اسلامی بم“ قرار دے کر کہہ رہی ہیں کہ یہ اسرائیل کے سر پر منڈلانے والا ایک مستقل خطرہ ہے۔ کولن پاول نے واضح اعلان کیا ہے کہ وہ اسرائیل کو ہر طرح کے خطرات سے آزاد اور بے فکر کرنے کا پابند ہے۔

پاکستان کی حکومت نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے پوری دنیا کے سامنے ایٹمی ٹیکنالوجی منتقلی کے ”جرم“ کا ”اعتراف“ کروا کر خود پاکستان کے خلاف ناقابل تردید شہادت فراہم کی ہے۔ امریکہ کو جب بھی افغانستان سے فرصت ملے گی اور اسے پاکستان کی حمایت کی ضرورت نہیں ہوگی تو وہ اسی شہادت کو بنیاد بنائے گا اور پاکستانی فوج اور پاکستانی حکومت کو ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی میں فریق ٹھہرا کر اسی بنیاد پر پاکستان کو اپنا ایٹمی پروگرام رول بیک کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بعد بھی ہم امریکہ کے حلیف رہیں گے؟ کیا ہم امریکہ کے اس طرح کے مطالبے کے سامنے بھی ”سب سے پہلے پاکستان“ کا جواز پیش کر کے سر تسلیم خم کر دیں گے؟ اس وقت حکمرانوں سے فوری طور پر اس بنیادی سوال کا جواب طلب کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ سوال کسی مفروضے پر مبنی نہیں ہے۔ یہ سوال اس عملی صورت حال سے ابھر کر سامنے



آیا ہے۔ کیا ہم امریکہ، بھارت، اسرائیل گٹھ جوڑ کے سامنے واقعی بے بس ہیں؟ یا ہم نے اپنی آزادی اور خود مختاری کی حفاظت کرنے کے لیے کوئی متبادل راستہ سوچ رکھا ہے؟ ہمارے حکمرانوں نے کئی بار کہا ہے کہ ہم کشمیر اور ایٹمی پروگرام پر کوئی سودے بازی نہیں کریں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نیوکلیر طاقت کے طور پر پاکستان کو اپنی خود مختاری اور آزادی سے محروم کرنا ممکن نہیں ہے لیکن جو راستہ سائنس دانوں کی تذلیل کر کے ہم نے اختیار کیا ہے یہ ایٹمی ہتھیاروں کی حفاظت کا راستہ نہیں بلکہ ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنے کا راستہ ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان بات چیت کا آغاز ہو چکا ہے۔ پاکستان کی کوشش ہوگی کہ کشمیر کے مسئلے کو مرکزی نکتے کے طور پر لیا جائے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان معمول کے تعلقات بحال ہونے میں یہی سدرہ ہے۔ دوسرے نکات میں سیاحین، وولر بیراج، سرکر یک، تجارتی تعلقات کی بحالی اور ثقافتی وفد کا تبادلہ شامل ہے۔ سیاحین، وولر بیراج، سرکر یک، دریاؤں کا مسئلہ، سب مسئلہ کشمیر کے شاخسانے ہیں۔ کشمیر پر پاکستان کا قومی موقف ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ یہ تقسیم ہند کے ایجنڈے کا باقی ماندہ حصہ ہے اور اس کا فیصلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیریوں کی مرضی سے کیا جائے، جب کہ بھارت مصر ہے کہ کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے اور اگر کوئی مسئلہ ہے تو صرف اتنا ہے کہ اس کے ایک حصے پر پاکستان کا قبضہ ہے۔ اب تک کا تجربہ تو یہی ہے کہ جب بھی پاکستان اور بھارتی وفد آمنے سامنے بیٹھے ہیں پاکستانی وفد نے تو انتہائی ذمہ داری کے ساتھ پوری تیاری کر کے کشمیر کے مسئلے کو سنجیدگی سے حل کرنے کے لیے تجاویز فراہم کی ہیں، لیکن بھارتی وفد نے انتہائی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اٹوٹ انگ والے موقف ہی کو دہرایا ہے۔

جنوری ۲۰۰۳ء میں سارک کانفرنس، اسلام آباد کے موقع پر دونوں ممالک کے ذرائع ابلاغ اور حکومتوں نے کشمیر کے مسئلے پر ”جمود ٹوٹنے“ کی جو فضا پیدا کی ہے بظاہر اس میں

کامیابی کے امکانات نظر نہیں آئے۔ حکومت پاکستان نے اپوزیشن کو اپنی خوش فہمی کی وجوہ کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ دونوں ممالک کے درمیان اچھے تعلقات کے قیام میں اصل رکاوٹ مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل سے بھارت کا انکار ہے۔ اگر بین الاقوامی دباؤ کے تحت اس بنیادی مسئلے کو نظر انداز کر کے باہمی اعتماد بحال کرنے کے بہانے دوسرے امور کو اولیت دی جائے گی تو اسے قومی مفادات اور مصلحتوں کے خلاف اور کشمیریوں سے بے وفائی قرار دیا جائے گا۔ جب تک کشمیر کے مسئلے کا منصفانہ حل تلاش نہیں کیا جاتا، اس وقت تک مظفر آباد سری نگر روڈ کھولنا اور اس پر بس چلانا کنٹرول لائن کو بین الاقوامی سرحد میں تبدیل کرنا ہے اور کشمیر کی مستقل تقسیم اور مسلم اکثریت کے ایک بڑے اور خوبصورت علاقے اور پورے پاکستان کی شہ رگ کو بھارت کے حوالے کرنے کے مترادف ہے۔ کشمیر کے مسئلے کا یہ ”حل“ نہ کشمیریوں کو قبول ہے نہ پاکستانیوں کو اور نہ اس طرح مسئلہ حل ہی ہو سکے گا۔ نہ امن قائم ہوگا نہ تعلقات بحال ہوں گے، البتہ حکومت پاکستان ایک بار پھر اپنی کوتاہ اندیشی، بے ہمتی اور بودے پن کا ثبوت فراہم کرے گی۔ یہ امریکہ کے اور بھارت کے سامنے بھی اپنی بے بسی کا مظاہرہ ہوگا اور اس کے بعد پاکستانی فوج اپنے موجودہ حجم کا جواز ہی کھودے گی۔

ہمیں اندیشہ ہے کہ دنیا کو یہ باور کرانے کے لیے کہ ”پاکستان انتہا پسند مذہبی معاشرہ نہیں ہے“ پرویز مشرف حکومت کہیں پاکستان کے بنیادی نظریہ اسلام ہی سے دستبردار نہ ہو جائے۔ حال ہی میں انہوں نے حدود قوانین پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ پاکستان میں عورت کے مقام کے حوالے سے جو کمیشن بنا ہے، اس میں ایسے لوگوں کو شامل کیا گیا ہے جو مسلمہ اسلامی قوانین کو متنازعہ بنانے کی شہرت رکھتے ہیں۔ پرویز مشرف نے اپنی ترقی پسندی اور ماڈرن ازم کے اظہار کے لیے پارلیمنٹ میں ۲۰ فیصد نشستیں خواتین

کے لیے مخصوص کردی ہیں اور ہماری دیہی کونسلوں میں بھی خواتین کی نمائندگی کو لازمی قرار دیا ہے۔

اسی طرح اقلیتوں کو نہ صرف انتخاب کے ذریعے عمومی نمائندوں کے انتخاب پر اثر انداز ہونے کا موقع دیا ہے بلکہ ساتھ ہی دوہری نمائندگی کے طور پر مخصوص نشستوں پر اسمبلیوں میں ان کی موجودگی کو بھی یقینی بنا دیا ہے۔ یہ عمل خود مغرب کے مسلمہ معروف جمہوری اصولوں کے منافی ہے۔ امریکہ میں تقریباً ۷۰ لاکھ مسلمان بستے ہیں لیکن ان کی کانگریس میں ایک بھی مسلمان ممبر نہیں ہے۔ فرانس میں مسلمانوں کی تعداد وہاں کی کل آبادی کا تقریباً ۶ فیصد ہے لیکن ان کی پارلیمنٹ میں کوئی مسلمان موجود نہیں ہے جبکہ پاکستان میں ۳ فیصد اقلیتوں میں سے ہر ایک اقلیت کو قومی اسمبلی میں نمائندگی کا حق دیا گیا ہے اور ساتھ ہی جداگانہ طرز انتخاب کو منسوخ کر کے مخلوط طرز انتخاب بھی رائج کر دیا گیا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود بین الاقوامی طور پر مغرب میں پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ برے سلوک کا واویلا کیا جا رہا ہے اور اس کے لیے قرآنی حدود کے قوانین اور توہین رسالت کے قانون کے تحت عورتوں اور اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک کا جھوٹا پروپیگنڈا زوروں پر ہے۔

پرویز مشرف صاحب کا معذرت خواہانہ رویہ مغرب کو یہ باور کرانے میں ناکام رہا ہے کہ پاکستانی معاشرہ اعتدال پسند ہے۔ دراصل مغربی میڈیا نے بدنیتی کی بنا پر حقائق کو نظر انداز کر کے یہ جھوٹا پروپیگنڈا کیا ہے کہ ہم انتہا پسند ہیں (اسلام کا تو بنیادی مزاج ہی اعتدال و توازن کا ہے)۔

ارسطو اور افلاطون جیسے فلسفیوں نے غلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ غلام وہ ہوتا ہے جو اپنے لیے سوچنے اور عمل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ انہوں نے یہ بات شاید اس



لیے کہی تھی کہ غلام خود تو فکر و عمل کی صلاحیت سے محروم ہیں اس لیے اب یہ آزاد لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ غلاموں کے لیے سوچیں اور منصوبہ بندی کریں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ آزاد لوگوں کی یہ ذمہ داری سفید فام لوگوں کی ذمہ دار بن گئی اور اب نئے عالمی نظام کے تحت یہ ”ذمہ داری“ امریکہ کو منتقل ہو گئی ہے۔ شاید اس لیے مسلمان ممالک کے حکمران امریکی آقاؤں کے اشاروں پر چلتے ہیں کہ اس طرح انھیں مزید برسر اقتدار رہنے اور اپنی قوموں کا استحصال کرنے کے لیے کچھ مزید مہلت مل جائے گی۔

امریکہ کی علانیہ پالیسی ہے کہ اسے کسی ملک میں مداخلت کرنے کے لیے کسی سے پوچھنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ وہ کسی ملک سے بزعم خویش کوئی خطرہ محسوس کرے تو اس خطرے سے محفوظ ہونے اور اس کا سد باب کرنے کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر حملہ (Pre-emptive strike) کر سکتا ہے اور اس طرح کرنے کے لیے اسے اقوام متحدہ یا کسی دوسرے ادارے سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصل میں سرکش ریاست (rogue state) کی صحیح تعریف یہی ہے کہ وہ ہر طرح کے بین الاقوامی ضابطوں کی پابندی سے آزاد ہوتی ہے۔ اس تعریف کے مطابق آج صرف امریکہ ہی ایک حقیقی سرکش ریاست ہے۔ افغانستان اور عراق پر جارحانہ قبضہ کرنے کے بعد اب اس نے ایران کو بھی مارچ کے آخر تک اپنے ایٹمی پروگرام کو کلیتہً ختم کرنے کا نوٹس دے دیا ہے۔ اس کے جواب میں ایرانی وزیر خارجہ نے کہا ہے کہ ایران ایٹم بم بنانے کا ارادہ نہیں رکھتا لیکن اس کے پاس ایٹمی ایندھن بنانے کی صلاحیت موجود ہے اور وہ نہ صرف اس صلاحیت کو برقرار رکھے گا بلکہ بین الاقوامی منڈی میں ایٹمی ایندھن کو فروخت بھی کرے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایٹمی پروگرام ایران کے لیے ایک اعزاز اور باعث افتخار ہے اور کوئی بھی ملک اپنے اعزاز اور اپنے مفاد اور مصلحت سے دستبردار نہیں ہوتا۔

ایرانی وزیر خارجہ کے اس بیان کے بعد ہمارے سامنے مستقبل کا خطرناک نقشہ بالکل واضح ہے۔ ایک اہم سوال تو یہ ہے کہ اگر امریکہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے قبل ایران میں مداخلت کرنے کا ارادہ ظاہر کرے تو پاکستان کا رویہ کیا ہوگا؟ کیا وہ ”سب سے پہلے پاکستان“ کا نعرہ بلند کرنے کے افغانستان کی طرح اپنے اس مسلمان پڑوسی کے خلاف بھی فرنٹ لائن اسٹیٹ بننے کے لیے تیار ہوگا؟ (اور پھر اپنی باری کا انتظار کرے گا) یا آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایران نے چین پر بھی ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی کا الزام عائد کر کے پاکستان، ایران اور چین میں تعاون کا راستہ پیدا کر دیا ہے۔

بڑھتے ہوئے امریکی استعمار سے انسانیت کو بچانے کے لیے تیاری کرنے اور سوچ بچار کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ نئے راستوں کی تلاش، ملکی دفاع اور سلامتی کی خاطر تمام سیاسی قوتوں کو مفاہمت کی دعوت دے اور انتقامی رویے چھوڑ کر (تمام سیاسی رہنماؤں سمیت) وسیع تر مشاورت کا اہتمام کرے تاکہ باہمی اعتماد و مفاہمت کے ذریعے بڑے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تدابیر سوچی جاسکیں۔

سترہویں ترمیمی بل کے پاس ہونے پر یہ پروپیگنڈا مہم شروع کر دی گئی ہے کہ متحدہ مجلس عمل کا حکمرانوں کے ساتھ سمجھوتا ہو گیا ہے اور مجلس عمل نے وردی میں صدر کو قبول کر کے فوجی مداخلت کو آئینی جواز فراہم کر دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مجلس عمل نے سترہواں ترمیمی بل پاس کیا ہے، ایل ایف او کو آئین کا حصہ تسلیم نہیں کیا۔

جنرل پرویز مشرف اور ان کے ہم نواؤں کا ابتدا سے یہ دعویٰ تھا کہ سپریم کورٹ نے پرویز مشرف کو آئین میں ترمیم کا حق دیا ہے اس لیے انہوں نے ایل ایف او کی صورت میں آئین میں جو ترمیم کی ہیں وہ آئین کا حصہ بن گئی ہیں اور پارلیمنٹ سے انھیں منظور کرانا کوئی آئینی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے ان کا یہ موقف تسلیم نہیں کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ

صرف وہی ترائیم آئین کا حصہ متصور ہوں گی جو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت سے پاس ہو جائیں گی۔ وزیراعظم ہاؤس میں تمام پارٹیوں کے سربراہوں کے اجلاس میں (جس میں اپوزیشن پارٹیوں کے سربراہ بشمول اے آر ڈی بھی شریک تھے) ایل ایف او کے سات متنازعہ نکات کی نشاندہی دہی کی گئی:

- ۱۔ ایل ایف او آئین کا حصہ نہیں ہے۔
  - ۲۔ ریفرنڈم کے ذریعے صدر کا انتخاب آئینی نہیں ہے۔
  - ۳۔ آئینی دفعات کو معطل کر کے ایل ایف او کے ذریعے چیف آف آرمی سٹاف اور صدر کے عہدے کو یکجا کرنے کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ یہ غیر آئینی بات ہے۔
  - ۴۔ آئین کی متعلقہ دفعات کا بحال ہونا آئین کی بحالی کا لازمی تقاضا ہے۔
  - ۵۔ ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر میں توسیع ناقابل قبول ہے۔
  - ۵۔ بلدیاتی انتخاب اور پولیس آرڈر ۲۰۰۲ء صوبائی دائرہ کار ہے اسے واپس صوبوں کے حوالے کر دیا جائے۔
  - ۶۔ قومی سلامتی کونسل کے ادارے کو آئین سے نکال دیا جائے۔
  - ۷۔ ۵۸-۲ بی کے تحت صدر کو اسمبلیاں توڑنے کا غیر مشروط اختیار نہیں ہونا چاہیے۔
- تقریباً چار ماہ تک مذاکرات ہوتے رہے۔ ان مذاکرات میں آخری دو تین نشستوں کے علاوہ اے آر ڈی کی جماعتوں نے بھی پوری دلچسپی سے حصہ لیا اور جو سمجھوتہ ہوا ہے بڑی حد تک ان کے مندوبین کو بھی اس سے اتفاق تھا۔ ہم نے اپنے سمجھوتے کے نکات کسی مرحلے پر بھی چھپا کر نہیں رکھے اور مذاکرات کی نشستوں کے بعد پارلیمنٹ میں اپوزیشن کے تمام ممبران کو باقاعدہ باخبر کرتے رہے اور پریس کے سامنے بھی اپنا موقف واضح کرتے رہے۔



چنانچہ سترہویں آئینی ترمیم کے ذریعے ہم نے بڑی حد تک حکومت سے اپنا موقف منوالیا ہے اور اس سال کے آخر تک جب جنرل پرویز مشرف چیف آف آرمی سٹاف نہیں رہیں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ فوج کا عمل دخل سیاست میں باقی نہیں رہا۔ کچھ لوگ یہ شبہ ظاہر کر رہے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف آئینی تقاضے کو پورا نہیں کریں گے اور آئین کو نظر انداز کر کے دونوں عہدوں پر بدستور براجمان رہیں گے لیکن اگر پرویز مشرف یہ کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ایک نیا مارشل لاء ہوگا اور نئے مارشل لاء کی صورت میں پرویز مشرف کو خود دست بردار ہونا پڑے گا۔ اس کا امکان اس لیے بھی نہیں ہے کہ فوج پہلے ہی کافی بدنام ہو چکی ہے اور ماضی میں فوج کی مداخلت اس مرحلے پر ہوئی ہے جب سیاست دان اپنی ناقص کارکردگی کی بنا پر لوگوں کی نظروں سے گر گئے اور لوگ خود فوج کی مداخلت کا مطالبہ کرنے لگے۔

اس وقت صورت حال برعکس ہے۔ فوج کی مداخلت سے لوگ تنگ آ چکے ہیں اور ان کی واپسی کا پرزور مطالبہ کر رہے ہیں۔ اب جوں جوں وقت گزر رہا ہے یہ بات لوگوں کے سامنے کھل کر آ رہی ہے کہ داخلی اور خارجہ پالیسی پر رائے کے لحاظ سے ملک میں اصل حزب اختلاف متحدہ مجلس عمل میں ہے جس کا اختلاف نہ ذاتیات پر مبنی ہے نہ اقتدار کے حصول تک محدود ہے اور نہ کسی کی جلاوطنی یا عدالتی مقدمات کی بنا پر ہی ہے بلکہ اصولی طور پر حکومت کی داخلی اور خارجہ پالیسیوں سے بنیادی اختلاف کی بنا پر ہے۔ یہ اختلاف رفتہ رفتہ لوگوں پر واضح ہو رہا ہے اور مخالفانہ جھوٹے پروپیگنڈے کی قلعی کھل رہی ہے۔

## عالم اسلام اور امریکہ — مفاہمت کی تلاش

سب سے پہلے میں قطر کے امیر شیخ حمد بن خلیفہ الثانی اور بروکنگز انسٹی ٹیوشن کا یو ایس اسلامک ورلڈ فورم کے انعقاد اور عالم اسلام اور امریکہ کی ممتاز شخصیات کے اس باوقار اجتماع سے خطاب کا موقع فراہم کرنے پر شکر گزار ہوں۔ امریکہ اور مسلم معاشروں کے مابین بڑھتی ہوئی کشیدگی کا جواب تلاش کرنا واقعی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ بروکنگز کے سببان سنٹر کا یہ نیا اقدام امریکہ کے اسکا لرز اور پالیسی سازوں کے اس احساس کا غماز ہے کہ بامقصد اور نتیجہ خیز مذاکرات ضروری ہیں اور ایک ارب ۴۰ کروڑ مسلمانوں اور دنیا کی بڑی طاقت کے درمیان ہم آہنگی بحال کرنے کے لیے وحشیانہ طاقت کا استعمال غیر ضروری ہے۔ میرے خیال میں اس سال کا اس سے اچھا آغاز اور نہیں ہو سکتا کہ اقوام متحدہ اسے تہذیبوں کے درمیان مکالمے اور افہام و تفہیم کے فروغ کے لیے مختص کر دے۔

سامعین کرام! ہم مانتے ہیں کہ امریکہ آج کرہ ارض پر سب سے زیادہ با اثر اور با وسائل قوت ہے اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے واحد عالمی قوت بن گیا ہے۔ اس کی عسکری طاقت سارے کرہ ارض پر محیط ہے اور آگ برسانے کی وہ طاقت اس نے حاصل کر لی ہے کہ انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ قریباً کھرب ڈالر دفاع اور سیکورٹی پر خرچ کرتا ہے جو ساری دنیا کے دفاعی اخراجات کے ایک تہائی سے بھی زیادہ ہے۔ ساری دنیا پر اس کا معاشی، سیاسی اور تہذیبی اثر چھایا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کا کوئی بھی ملک اپنے

خطے میں امریکی پالیسیوں اور منصوبوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کو بھی ایک قوت سمجھنا چاہیے۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ مسلمان انسانی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں جو ۵۶ آزاد ممالک میں اکثریت اور بشمول امریکہ باقی دنیا میں ایک نمایاں اقلیت ہیں۔ عالم اسلام کو بڑی اسٹریٹجک سیاسی اور اقتصادی اہمیت حاصل ہے۔ حکومتوں اور داخلہ و خارجہ روابط کی ناکامی کے باوجود مسلم عوام پر عزم ہیں اور ہر اس کوشش کی مزاحمت کرتے ہیں جو ان کی آزادی و خود مختاری اور دینی معاملات میں مداخلت کرے۔

اسی تناظر میں امریکہ اور عالم اسلام کے تعلقات کو دیکھنا چاہیے۔ ہماری رائے ہے کہ ان تعلقات کو باہمی احترام، مکالمے، افہام و تفہیم اور عدل، کثیر جہتی اور بقائے باہمی پر مبنی عالمی نظام کے قیام کی بنیاد بننا چاہیے۔ مگر افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ عالم اسلام اور امریکہ کے تعلقات کی تاریخ زیادہ دوستانہ نہیں ہے۔ ہمارے اختلافات اور انھیں پروان چڑھانے کے اسباب کا غیر جانب دارانہ تجزیہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ دونوں طرف بہت سی غلط فہمیاں ہو سکتی ہیں لیکن میری نگاہ میں امریکہ اور عالم اسلام کے تعلقات میں سب سے اہم عامل ان اعلیٰ اخلاقی اقدار جن کا امریکہ علمبردار ہے اور عالم اسلام سے تعلقات میں امریکی حکومتوں کے طرز عمل میں پایا جانے والا تضاد ہے۔ جب ہم امریکہ کی پالیسیوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں عالم اسلام میں شخصی حکومتوں کی امریکی تائید، یکطرفہ پابندیاں، تجارتی بندشیں، اسٹریٹجک دفاعی تنصیبات کے معائنے اور علاقائی تصادموں میں مخالفانہ رویہ عام نظر آتے ہیں۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے بین الاقوامی اداروں کی پالیسیوں کو استعمال کرتے ہوئے آزاد ممالک کو اپنے ایجنڈے پر راضی کرنا بھی ہمارے تعلقات میں ناراضی اور نفرت پیدا کرتا ہے۔ خارجہ پالیسی کے یہ تمام حربے دو آزاد اور خود مختار مسلم ممالک



افغانستان اور عراق پر حالیہ کھلے حملے اور قبضے کے لیے استعمال کیے گئے۔

معزز سامعین! یہ بہت اہم ہے کہ واشنگٹن کے پالیسی ساز سمجھیں کہ امریکہ کو باقی دنیا کس نظر سے دیکھتی ہے۔ امریکہ کے استعماری خواب یا کردار کو فروغ دینے والی پالیسیاں رائے عامہ کے لیے ناقابل قبول اور ناقابل فہم ہیں اور یہ انسانی فطرت کے بھی خلاف ہیں کیونکہ اکیسویں صدی میں اجارہ داری، استبداد اور تسلط کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تنہا طاقت، پیشگی حملے، انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیاں جیسے گوانٹانامو جزیرے میں یا امریکی مسلمانوں کے ساتھ ہو رہی ہیں، اقوام متحدہ کو خاطر میں نہ لانا یا اس کی قراردادوں کو نظر انداز نہ کرنا، نائن الیون کے بعد سے طاقت کے استعمال پر فریفتگی وہ فعل ہیں جو عالمی رائے، وژن اور اقدار کے خلاف ہیں۔ مسلمان ہی نہیں بلکہ ساری مہذب دنیا حتیٰ کہ امریکہ کے بانی سب اس کے خلاف ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آزادی، جمہوریت اور فرد کی بہبود سارے بنی نوع انسان کی مشترکہ اقدار ہیں۔ اسی طرح انسداد دہشت گردی کے اقدامات، سیکورٹی اور انسانی بھلائی مشترکہ مقاصد ہیں لیکن یہ اعلیٰ اقدار اس وقت اپنا مفہوم کھو بیٹھتی ہیں جب انھیں حملوں اور کمزور قوموں کے وسائل، طرز زندگی اور اقدار پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ گزشتہ دو برس سے جس طرح دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری ہے، اس نے عالم اسلام میں بڑے پیمانے پر بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ فلسطین، کشمیر اور چیچنیا کی حق خود ارادیت کی جدوجہد کو جس طرح دہشت گرد تحریکیں کہہ کر بدنام کیا جا رہا ہے، اس سے امریکی پالیسیوں کے دوہرے معیار بے نقاب ہو گئے ہیں۔ جب ہم مسلمان عورتوں اور بچوں کو فلسطین، کشمیر، چیچنیا، عراق اور افغانستان میں اپنے ہی گھروں کے بلے پر بیٹھے روتے دیکھتے ہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان پر دہشت گردی کا الزام کیسے لگ سکتا ہے۔

معزز سامعین! ہم امت مسلمہ کے نمائندوں کی حیثیت سے عالمی لیڈروں کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم امن، خوشحالی اور سارے بنی نوع انسان کی آزادی کے لیے فکر مند ہیں۔ ہم سارے انسانوں کو ایک برادری سمجھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”کسی عربی کو غیر عربی (عجمی) پر یا غیر عربی کو عربی پر، گورے کو کالے پر یا کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔“

ہم عالمگیر انسانی برادری پر یقین رکھتے ہیں اور اسلام کو ماننے والوں پر اسلامی تعلیمات کی رو سے انسانیت کی خدمت فرض ہے۔ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ (النساء: ۵۸)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا، اعْدِلُوا فَوَ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (المائدہ: ۸)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔“

اب یہ امر یکہ کو فیصلہ کرنا ہے کہ اسے اپنے ان عظیم رہنماؤں کی اقدار کی طرف پلٹنا

چاہیے۔ جیفرسن آزادی و جمہوریت کا علمبردار تھا جسے بیسویں صدی کے حریت پسندوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں پسند کیا، ولسن کے اصولوں میں حق خود ارادیت ناقابل انکار حق قرار دیا گیا ہے۔ فرینکلن روز ویلٹ کی تیسری دنیا میں استعمار مخالف جدوجہد کی تائید نے مظلوم اقوام کو جذبہ دیا ہے یا امریکہ اخلاقی ساکھ سے محروم وحشیانہ قوت پر انحصار کی موجودہ روش جاری رکھ سکتا ہے جو امریکہ کو اس کے اپنے دوستوں اور یورپ کے اتحادیوں میں بھی تنہا کر سکتی ہے، مسلم دنیا کو ایک طرف چھوڑ دیجیے۔

اہل علم اور دانشور حضرات سے میری اپیل ہے کہ تاریخ کے اس نازک دور میں ان مسائل پر اخلاقی و اصولی موقف اپنائیں اور امریکی پالیسی کو مثبت سمت کی طرف لے جانے میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ یہ نہیں کہا جانا چاہیے کہ ایسے ذہین لوگوں نے کچھ کام نہ کیا یا وہ ناکام ہوئے کیونکہ ان میں سچ کہنے، عدل قائم کرنے اور امریکہ کی جنگ آزادی کے بنیادی اصولوں کو فروغ دینے کی اخلاقی جرأت نہ تھی۔

خواتین و حضرات! میں یہ اہم موقع فراہم کرنے پر ایک بار پھر آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(فروری ۲۰۰۲ء)



## ملت کا حدی خواں

یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے ہر دور میں ایسے انسان پیدا کرتا ہے جو حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور انھیں گمراہی اور انحراف سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مشیتِ حق سے اُمتِ مسلمہ میں بھی وقتاً فوقتاً اس طرح کی شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا ہے:

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے  
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار  
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں  
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

مولانا مودودیؒ نے بھی عہدِ حاضر میں اُمت کی بیداری اور دین کی طرف اس کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ وہ قرآن و سنت اور علومِ اسلامیہ کے دیگر سرچشموں سے علم و عرفان کا نور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی فکر و فلسفے کی تہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے تجزیے اور دلیل کا راستہ اختیار کیا، عصرِ حاضر کے علمِ کلام سے استفادہ کیا اور اسے اسلامی علمِ کلام کے سانچے میں ڈھال کر اظہار و بیان کا منفرد اسلوب اختیار کیا۔ ان پر یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم تھا کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کو پہلے صاف اور عام فہم سوال میں خود

ڈھالتے تھے پھر اس کا تجزیہ کر کے بالکل آسان پیرایے میں بنیادی اہمیت کے معاملات کو کھول کھول کر بیان کر دیتے تھے۔ اسلامی نظامِ زندگی خلافتِ راشدہ کے بعد رفتہ رفتہ گردشِ لیل و نہار اور حاشیہ در حاشیہ کتابوں کے انبار میں نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ تاہم مولانا مودودیؒ نے اسلامی نظامِ زندگی کو انسانی ہدایت کے ایک واضح لائحہ عمل کے طور پر متعارف کروایا۔

مسلمانوں کے ہاں مغربی تہذیب کی حاکمانہ برتری نے عوام و خواص کے ذہنوں کو زبردست قسم کی ذہنی غلامی سے دوچار کر دیا تھا۔ مولانا مودودیؒ نے قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے جدید اسلوب اور نہایت مؤثر انداز میں تحقیقات کے مضامین کے ذریعے اس تہذیب کے فکری تار و پود بکھیر دیے۔ انہوں نے جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو ایمان سے سرشار اور عقلی و علمی دلائل سے مسلح کیا۔ مزید یہ کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات، یکساں طور پر ایک فاضل اور ایک عام فرد کے ذہن نشین کرادیں۔

”خطبات“ اور ”دینیات“ بنیادی طور پر عام فرد کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں اور دعوتِ حق اور بلکہ فہمِ دین کے لیے یہ نہایت درجہ بنیادی اور سب سے زیادہ قیمتی کتب ہیں۔ یہ وہ کتب ہیں جو فرد کا رشتہ خالقِ ارض و سما سے جوڑتی ہیں اور رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور اطاعت کا درس دیتی ہیں۔ اگر پہلے مرحلے میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی شک و شبہ سے بالاتر طمانیتِ قلب والا تعلق جڑ جائے تو پھر زندگی کے آئندہ مراحل اس سعادت و رحمت کے راستے پر ہی گزرتے ہیں۔ ان کتب کے بعد میں ”اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر“ کو مطالعے کا نہایت اہم جز سمجھتا ہوں۔

مولانا مودودی کے لٹریچر میں اس کے بعد جس خطبے کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جو بے شمار کتابوں پر بھاری ہے اس کا نام ”اسلامی حکومت کس طرح قائم

ہوتی ہے؟“ مولانا مودودی نے یہ تقریر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کے سامنے فرمائی تھی۔ عصر حاضر کے اسلامی لٹریچر کو اس تقریر نے اپنی گرفت میں لے کر ایک منزل کا سراغ دیا۔ افغانستان کے عظیم انقلابی اور دانشور منہاج الدین ’گہیز‘ شہید (م: ۱۹۷۲ء) نے مجھے بتایا کہ ”اس تقریر (فارسی: برنامہ انقلاب اسلامی) نے میرے ذہن کے تمام درتے کھول دیے ہیں اور میرے تمام اشکالات کا جواب دے دیا ہے“ یاد رہے کہ منہاج الدین گہیز پہلے ایک قوم پرست رہنما تھے اور اس کتاب کے مطالعے کے بعد اسلام کے داعی بن گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ مولانا مودودی کی یہ مختصر تحریریں انسانوں کی زندگیاں بدل دینے کا ذریعہ بنیں۔ اسی طرح مولانا کی تقریر ”شہادتِ حق“ نے بے شمار لوگوں کی زندگیوں کو اللہ کی راہ پر لگا دیا۔

مولانا مودودیؒ پر یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل تھا کہ ان کے ذہن میں اسلامی نظام کا خاکہ اور نقشہ کار ایک ترتیب سے دو اور دو چار کی طرح واضح تھا۔ وہ اس معاملے میں بڑے یکسو تھے کہ ایک معاشرے کو اسلامی معاشرے میں کیسے ڈھالا جائے؟ اس کی ترجیحات کیا ہیں؟ اس کا عملی ڈھانچا کیا ہے؟ اور کن چیزوں کو کس ترتیب سے لانا چاہیے؟ انہوں نے اسی ترتیب سے یہ سبق لوگوں کو ذہن نشین کرادیا۔

اسی دور میں امام حسن البنا شہید نے مصر میں ایک دوسرے انداز میں کام شروع کیا۔ بعد ازاں ان کے ایک حلقہ گوش سید قطبؒ کی بلند پایہ علمی تحریروں نے نوجوان نسل کو بڑی کثرت سے اسلام کے انقلابی پہلو کی طرف متوجہ کیا۔ ترکی میں بدیع الزماں سعید نورسی مرحوم نے دعوتِ تربیت اور مزاحمت کی ایک منفرد تحریک برپا کی۔ ہمارے یہاں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت ناقابلِ فراموش ہے۔ ان کے ہاں حزب اللہ اور نظم اسلامی جماعت کا تصور مولانا مودودی کے تصورِ جماعت اسلامی سے ملتا جلتا ہے اور پھر علامہ اقبالؒ



کے پورے کلام میں بھی اُمتِ مسلمہ کو نہایت دل نشین انداز میں قرآن و سنت ہی کا پیغام پہنچایا گیا ہے۔

اسلام میں رہبانیت کی گنجائش نہیں ہے؛ بلکہ اسلام ایک نظامِ زندگی کے طور پر دعوتِ عدل اور قوت کے ساتھ اُبھرتا نظر آتا ہے۔ اس تصور کے حوالے سے علامہ اقبالؒ کی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میرے نزدیک مرکزی شان کی حامل ہیں۔ اسرارِ خودی میں ایک مسلمان فرد کے کردار کے بنیادی عناصر اور اس کے تقاضے بتائے گئے ہیں؛ جبکہ رموزِ بے خودی میں علامہ اقبالؒ نے واضح کیا ہے کہ اس کردار کے لوگوں کو ایک اسلامی قوم میں کن اصولوں کے ذریعے ڈھالا جاتا ہے۔ اس پیغام کو انہوں نے اپنی معروف نظم ”ترانہ ملی“ میں جس عمدہ اور پرتاثر پیرایے میں پیش کیا ہے وہ پڑھنے اور درس لینے سے تعلق رکھتا ہے:

چھین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا  
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا  
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے  
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

علامہ اقبالؒ شعر کی زبان میں بات کرتے تھے اس لیے کلامِ اقبال سے اسلامی نظامِ زندگی کی دعوت سامنے آنے کے باوجود عملی اور منطقی انداز سے ذہن نشین نہیں ہو سکتا تھا۔ شعر کا تاثر فرد کو سوچنے پر ابھارتا؛ شعر کا مضمون اور آہنگ طبیعت میں وجدلاتا ہے۔ اسلام کے نظامِ حیات کے تصور کو اقبالؒ نے خواب سے بڑھ کر جذبے میں ڈھالا؛ جبکہ مولانا مودودیؒ نے ترتیب کے ساتھ ایک مربوط تحریر اور ایک نکھرے پروگرام میں اسے مدلل انداز میں بیان کر دیا۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے قارئین کے ذہنوں میں ایک بیداری پیدا کی جس کے بعد ان

بیدار ضمیر لوگوں کو ایک اجتماعیت کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو مولانا مودودیؒ نے پورا کیا۔ انہوں نے بتایا کہ منتشر نیکی اور اعلیٰ جذبے کو جب تک اجتماعی طاقت میں نہیں بدلا جاتا، وہ جذبہ اور نیکی محض ایک اعلیٰ قدر تو ہو سکتی ہے مگر مثبت قوت نہیں قرار دی جاسکتی۔ اس کے مقابلے میں ابلیسی طاقت منظم بھی ہے اور موثر بھی۔ اس کی پشت پر افراد اداروں اور ریاستوں کی طاقت ہے۔ مولانا مودودیؒ نے خدا سے غافل اور ظلم پر مبنی اس جاہلیت کا جواب دینے کے لیے واضح مقصد اور شفاف طریق کار پر مشتمل ایک تحریک برپا کی۔ یہ کام انہوں نے محض تحریریں لکھ دینے کی حد تک نہیں کیا، بلکہ انہوں نے قرآنی حکم کے تحت اسے بنیاد پر موقوف بنانے کے لیے ایک ایک تنکا اکٹھا کر کے آشیانہ بنایا۔ ایک ایک فرد کو مجتمع کر کے قافلہ ترتیب دیا۔ اللہ تعالیٰ کے ایک ایک حکم کے سائے میں مطلوب اور معتدل نظام فکر پیش کیا۔ میں اس کارنامہ عظیم کا کسی بزرگ ہستی سے کوئی موازنہ کیے بغیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ عصر حاضر میں یہ کاوش درحقیقت اللہ تعالیٰ کا خصوصی احسان ہے جس کے لیے اُس نے اپنے بندے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو خدمت کے لیے چنا۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اسلامی تنظیم جماعت کا تصور پیش فرمایا لیکن بہت جلد وہ خود ایک سیکولر تنظیم جماعت کا حصہ بن گئے۔ اس اقدام کو مولانا مودودیؒ نے ایک المیہ قرار دیا اور فرمایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اس امت کے فکری اور عملی دکھوں کا علاج کرنے کے لیے ایک معالج کے طور پر آئے، لیکن کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے مایوس ہو کر اس مریض کو لا علاج قرار دے کر چھوڑ دیا۔ مگر میں تو اس مریض کا معالج نہیں بلکہ تیماردار ہوں۔ معالج چھوڑنا چاہے تو چھوڑ دے لیکن تیماردار اپنے مریض کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ مولانا مودودیؒ کے اس قول میں کوئی دعویٰ تعسلی اور فخر کی بات نہیں ہے بلکہ دلسوزی، ہمدردی اور ذمہ داری کی دعوت ہے۔

گزشتہ صدی کے آغاز میں مسلم اُمہ کس حال میں تھی اس کا تذکرہ اگرچشمِ تر پڑھنا ہو تو خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کی مسدس پڑھیں تو اُمت کی حالتِ زار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مسدس میں تفصیل کے ساتھ مسلم اُمہ کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ ان کے بالکل ہی متصل علامہ اقبالؒ ایک مجاہدانہ لہجے میں کہتے ہیں:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے در ماندہ کارواں کو

شررِ فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اقبالؒ نے روتے ہوئے لوگوں کے آنسو پونچھے اور انہیں حوصلہ دے کر کھڑا کیا۔ ان

ہمت شکن حالات میں کھنڈرات پر کھڑے ہو کر مولانا مودودیؒ نے اُمید کا دامن پکڑا اور بلے

کے ڈھیر سے اینٹیں چن چن کر عمارت کی تعمیر شروع کی اور نظمِ جماعت قائم کیا۔ بلند ہمتی کے

ذریعے اگلے سو سال کا صاف سیدھا نقشہ بنا کر پیش کر دیا۔ یاد رہے کہ لمبے عرصے کا منصوبہ

بنانا اور صبر و ہمت سے منصوبے کے خدوخال واضح کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ ہمارے

ہاں مستقبلِ بنی اور مستقبل کی منصوبہ سازی کا کوئی رواج نہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اقبالؒ

”آنے والے دور کی دھندلی سے اک تصویر“ ہی نہیں دکھاتا بلکہ پورا اور ایک واضح منظر

آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے اور مولانا مودودیؒ اس منظر تک پہنچنے کے لیے راستے کی

مشکلات و مصائب سے نہ صرف آگاہ کرتے ہیں بلکہ انہیں ان مشکلات سے عہدہ برآ

ہونے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کا لائحہ عمل بھی دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے عصرِ حاضر میں

احیائے اسلام کی تحریک کے یہ دونوں بڑے نام یعنی علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ ہاتھوں

میں ہاتھ ڈال کر اُمت کو پکارتے ہیں۔ اگر کوئی کھلی آنکھوں کے ساتھ علامہ اقبالؒ کے شعری



۱۰۵ — مضامین قاضی حسین احمد

کلیات اور مولانا مودودیؒ کی کتب کو بغور پڑھ لے تو وہ خود اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ ان کی پکار ایمان اور عمل کی پکار ہے، جہاد اور اجتہاد کی پکار ہے، ایثار اور اقدام کی پکار ہے، عدل اور امن کی پکار ہے، اُمت اور اتحاد اُمت کی پکار ہے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے جماعت اسلامی کی تشکیل سے پہلے گہرے غور و فکر سے کام لیا اور بہت سے اصحاب سے یہ مشاورت کی کہ آیا جماعت بنائی بھی جائے یا نہیں؟ پھر جب جماعت بنانے کا فیصلہ ہوا تو آپ نے جماعت اس لیے بنائی کہ ”منظم شرکاء مقابلہ منظم نیکی ہی کر سکتی ہے“ آپ نے صاف طور پر کہا ہماری دعوت، دعوت الی اللہ ہے۔ یہ دعوت اسوۂ حسنہ کی طرف دعوت ہے۔ ہماری دعوت اپنے بانی یا جماعت کی طرف نہیں، مقصد کی طرف ہے۔ جماعت صرف ایک ذریعہ ہے، مقصد نہیں ہے۔ مقصد قرآن کریم سے لیا گیا ہے کہ اللہ کو راضی کرنا ہے۔ طریق کار سنت سے لیا گیا ہے کہ وہی آئیڈیل ہے اور وہی معیار حق ہے۔

مولانا مودودیؒ نے جماعت کو کوئی فرقہ، گروہ یا مسلک نہیں بننے دیا بلکہ تمام مسلمہ مکاتب فکر کے افراد کو دعوت دی کہ وہ ایک بڑے مقصد کے حصول کے لیے ایک پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ پاکستان بنانے اور پاکستان کا دفاع کرنے کے لیے اگر تمام مکاتب فکر اکٹھے ہو سکتے ہیں تو پاکستان کو اس کا مقصد وجود دلانے کے لیے آخر کیوں وہ ٹکڑوں میں تقسیم رہیں۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی نئی فکر دینے والے یا کوئی نیا راستہ تجویز کرنے والے نہیں ہیں، بلکہ وہ قرآن کی فکر کا تذکرہ کرنے اور اس فکر کے راستے کی نشاندہی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے ایک عاجز بندے ہیں۔ مولانا مودودیؒ یہی کہتے تھے آپ میری فکر نہ کریں اور نہ میرے دفاع کے بارے میں پریشان ہوں بلکہ آپ مقصد زندگی کی فکر کریں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے راستے پر چلنے کی فکر کریں اور اپنے مسلمان

بھائیوں کو ان تعصبات سے نکالنے کی کوشش کریں کہ جس نے انہیں کفر و استعمار کے سامنے ترنوالہ بنا دیا ہے۔

وہ کہتے تھے جن تعصبات میں مسلم جماعتیں مبتلا ہو گئی ہیں، انہیں اس دلدل سے نکالیں اور اصلاحی جماعتیں فرقہ بندی کی بندگلی میں پھنس کر رہ گئی ہیں، انہیں قرآن و سنت کی دعوت کی طرف بلائیں اور اس الجھن سے چھٹکارا دلا دیں۔ اس لیے میرے نزدیک فکر مودودیٰ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی تسلسل میں یہ بات بھی بالکل واضح رہنی چاہیے کہ معیارِ حق اور رہنمائی کا اول و آخر مرکز، قرآن و سنت ہیں۔ ماضی میں مختلف دینی تحریکیں شخصی سطح پر غلو کا شکار ہو گئی تھیں اور فی زمانہ مولانا مودودی نے برملا فرمایا کہ مجھے معیار مت سمجھئے۔ انہوں نے کھلے دل کے ساتھ لوگوں کو بلایا اور اپنی بجائے اصل مراکز دعوت کی طرف رواں دواں کر دیا۔ انہوں نے زندگی بھر جماعت کو اپنی تحریروں کا پابند نہیں بنایا، البتہ جماعت نے جو فیصلے کیے، کارکنان کو اس کی پابندی کرنے کے لیے کہا اور جب جماعت نے فیصلے میں تبدیلی کی تو انہوں نے بھی اس کو تسلیم کیا۔ وہ اپنی تحقیقات کو بھی حرفِ آخر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں پیری مریدی یا خادم و مخدوم اور آقا و کارکن کا کوئی تصور تک نہیں تھا۔ بلاشبہ مولانا مودودی کی کتب روشنی کا ایک مینار ہیں لیکن روشنی کا واحد مرکز یہ نہیں ہیں۔ اسی لیے جماعتِ اسلامی اور اس کی برادر تنظیموں کے نصابات میں آپ کو دکھائی دے گا کہ مولانا کی تو آدھی کتب بھی مطالعے کے لیے لازم نہیں ہیں۔ وہ ہمارے محسن ہیں اور ہم ان کے زیرِ احسان ہیں لیکن اس کے ساتھ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ زندگی بھر اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کرتے رہے۔ خود انہوں نے مسلم تاریخ پر جس طرح احتسابی نگاہ ڈالی بالکل اسی طرح وہ بھی آنے والے تمام لوگوں کی طرح اسلام کی کسوٹی پر پرکھے جائیں گے۔

تیسرا پہلو جس کی طرف ہمیں آج توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ مسلم امت کا حالِ زار



ہے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے جب ہوش سنبھالا، اُس وقت برطانوی استعمار نے دنیا کے ایک بڑے حصے پر تسلط قائم کر رکھا تھا اور مسلم دنیا کا کم و بیش سارا ہی علاقہ محکوم تھا۔ بظاہر جو ممالک آزاد دکھائی دیتے تھے وہ بھی بالواسطہ طور پر برطانیہ یا یورپی اقوام کے زیر نگیں تھے۔ مولانا مودودیؒ نے اس وقت یہ بنیادی سوال اٹھایا:

”مسلم دنیا کو اسلامی دنیا اور مسلم معاشرے کو اسلامی معاشرہ کیسے بنایا جائے؟“

حقیقت میں یہ بڑے بنیادی سوالات تھے جن پر انہوں نے بحث کی۔ انہوں نے مرض سے پہلے مرض کے اسباب اور مرض کی شدت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مولانا مودودیؒ کی وہ تمام تحریریں جو ۱۹۴۰ء سے پہلے انہوں نے لکھی تھیں، ان میں استعمار کے چہرے کو بے نقاب کرنے اور مسلم دنیا کو بیدار کرنے کا پورا لائحہ عمل موجود ہے۔ ایک بڑے معرکے سے دو چار لوگوں کو چند سو صفحات پر مشتمل یہ تحریریں پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا کہ استعمار کی دنیاوی کامیابی اور دنیا بھر میں امت مسلمہ کی بے کسی کا سبب کیا ہے؟ اس مطالعے سے قاری کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس تسلط اور جال کو توڑنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

مولانا مودودیؒ نے خطبات کے ایک حصے حقیقت جہاد میں یہ بڑی پتے کی بات تحریر فرمائی ہے کہ ”حکومت کی خرابی تمام خرابیوں کی جڑ ہے“ اور یہ تقریر انہوں نے ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کی تھی جب ہندوستان غیر منقسم تھا اور پاکستان کا وجود نہیں تھا۔ برطانیہ کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، تب انہوں نے فرمایا اگر اقتدار اور اختیار کے سرچشموں پر خدا کے باغی، خائن اور انسانیت کے دشمن لوگ بیٹھے ہوں گے تو انسانیت کبھی سکون اور عدل سے ہمکنار نہیں ہو پائے گی۔ اسی لیے آج حالات جس قدر خراب ہیں، ان میں کھلے عام افہام و تفہیم سے، دلیل اور اجتماعیت سے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مسلم دنیا میں حکومتی مناصب پر فائز لوگوں کو یہ سمجھایا جائے کہ وہ دنیاوی طاقتوں کا ڈر اور خوف دل سے نکال دیں۔ ڈر اور خوف



تو صرف مالکِ حقیقی کا ہونا چاہیے۔

مولانا مودودیؒ نے اس کے لیے خفیہ کام کرنے سے منع فرمایا کہ خفیہ تنظیمیں اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتیں اور دنیا بھر کا بوجھ اُن پر ڈال دیا جائے تو وہ اس کی وضاحت تک کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔ مولانا نے تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے ہمیشہ منع فرمایا اور جماعت کا دستور انھی کی رہنمائی میں بنا جس نے پر تشدد کا رروائی کے لیے جماعت کے دروازے بند کر دیے۔ اس لیے ردِ عمل کی سیاست، تشدد کے عمل اور تشدد کی طرف داری سے بچنا تحریک کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔

مضمون: اسلام کے اصول و ضوابط میں مذکور اسلامی سربراہی کا نفرنس رباط

## ۱۰۹ — مضامین قاضی حسین احمد

اندازہ ہوتا ہے کہ چند سطروں کی قرارداد مقاصد اور پھر علماء کے ۲۲ نکات پاکستان کی ریاست کے دستور اور قانون سازی کی تاریخ میں کتنی اہم اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں اور ان دونوں دستاویزات کی تیاری اور منظوری میں مولانا مودودیؒ نے جو کلیدی رول ادا کیا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بڑا انعام ہے۔

علم اور عمل، ایمان اور اجتہاد، مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی تمام تر جدوجہد کا محور تھا۔ آج ہمیں نہ صرف اہل وطن بلکہ پوری اُمت کو اس طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔  
(اکتوبر ۲۰۰۳ء)

## قومی انتخابات ۲۰۰۲ء

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں پرویز مشرف صاحب کو تین سال کی جو مدت دی تھی وہ اب مکمل ہو رہی ہے۔ ان کی حکومت نے جو سات نکاتی ایجنڈا قوم کے سامنے پیش کیا تھا، اس کا پہلا نکتہ قوم کو مایوسیوں سے نکال کر انھیں اعتماد دینے کا ایجنڈا تھا۔ اس لحاظ سے یہ حکومت مکمل طور پر ناکام ہو گئی ہے۔ موجودہ حکومت قوم کو کوئی نشانِ منزل نہیں دے سکی ہے بلکہ ملک بنانے والوں نے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کو اسلامی مملکت بنانے کے جس مقصد کے لیے متحد کیا تھا، جس کے لیے انھیں قربانیوں پر آمادہ کیا تھا، جس کی خاطر لاکھوں جانوں کی قربانی دی گئی تھی اور جس کی خاطر ایک کروڑ لوگوں نے اپنے گھر بار چھوڑ دیا تھا، موجودہ حکومت نے سیکولر ازم اور کمال ازم کا تذکرہ کر کے اور نصابِ تعلیم اور دینی مدارس میں مداخلت کر کے اس منزل کو بھی متنازعہ بنانے کی کوشش کی۔ موجودہ حکومت نے امریکی اتحاد میں شمولیت اختیار کر کے تہذیبوں میں جنگ میں عملاً اسلام اور مسلمانوں کے خلاف امریکہ کا ساتھ دیا ہے۔ امریکی افواج کو افغانستان میں مداخلت کی خاطر ہوائی اڈے فراہم کیے۔ ان کے ہوائی جہازوں اور میزائلوں کے لیے اپنی فضا فراہم کی اور انھیں خفیہ معلومات فراہم کیں۔

مغربی اقوام اور امریکہ کے دباؤ کے تحت موجودہ حکومت اپنی کشمیر پالیسی سے دستکش اور کشمیری مجاہدین کی امداد سے دستبردار ہو گئی ہے۔ اس نے جہاد کو دہشت گردی اور مجاہدین



۱۱۱ ————— مضامین قاضی حسین احمد

کی امداد کے لیے آزاد کشمیر سے مقبوضہ کشمیر میں جانے کو دراندازی تسلیم کر کے اس کو بند کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں۔ موجودہ حکومت کے ان اقدامات سے امریکہ تو خوش نہ ہو سکا کیونکہ امریکی اور مغربی پالیسی صیہونی اور بھارتی مفادات کے تابع ہے۔ البتہ اس کے نتیجے میں حکومت نے ملک کے اندر امریکہ اور بھارت کے خلاف موجود شدید نفرت کا رُخ اپنی طرف موڑ لیا ہے۔

اگر محبت وطن اور بیدار مغز دینی قیادت لوگوں کی صحیح رہنمائی کر کے ان کی جدوجہد کو مثبت راستوں پر نہ ڈالتی تو حکومت نے اس صورتحال سے تخریبی قوتوں کو فائدہ اٹھانے کا پورا پورا موقع فراہم کر دیا تھا۔ ملک کے اندر تخریبی کارروائیوں کی مذمت کر کے اور چرچ اور مشنری اسکول اور مشنری ہسپتال پر حملوں کو اسلام دشمن قوتوں کی کارروائی قرار دے کر دینی قیادت نے ملک کو تخریب کاروں کی آماجگاہ بننے سے بچایا ہے۔

حکومت کی پالیسیوں کے نتیجے میں پاکستان میں امن و امان کی حالت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ سرمایہ کار اپنا سرمایہ طویل مدت کے صنعتی منصوبوں میں لگانے سے گریزاں ہیں۔ لہذا بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ درآمدی اور برآمدی تجارت کی مقدار کم ہو گئی ہے اور قوم بے یقینی کا شکار ہے۔ پاکستانی قوم کو اپنی ایٹمی صلاحیت پر ناز تھا لیکن یہ صلاحیت بھی اب پوری طرح امریکی نرغے میں ہے۔ افغانستان میں امریکہ اور اس کے مغربی اتحادی فوجوں کی حکومت ہے جنہیں مزاحمت کا سامنا ہے۔ اب امریکی پاکستان کے قبائلی علاقے میں بھی مداخلت کر رہے ہیں اور بہانہ یہ بنا رہے ہیں کہ وہ القاعدہ کے مجاہدین کا پیچھا کرنے کے لیے آتے ہیں۔ پاکستانی افواج امریکی دباؤ کے تحت قبائلی علاقے میں ان کا ساتھ دے رہی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف ہماری مغربی سرحدیں غیر محفوظ ہو گئی ہیں بلکہ پہلی مرتبہ ہماری افواج کو داخلی طور پر بھی مخالفت کا سامنا ہے۔

تین سالہ ناکام دور کے خاتمے پر جنرل پرویز مشرف صاحب اس خوف سے دو چار ہیں کہ آزادانہ انتخابات کے نتیجے میں جو منتخب اسمبلیاں معرض وجود میں آئیں گی وہ اگر ان کے حسب منشا لوگوں پر مشتمل نہ ہوں تو ان کو اپنے اقدامات کے لیے جواب دہی کرنا پڑے گی۔ اس خوف کی وجہ سے پرویز مشرف حکومت نے انتخابات سے حسب منشا نتائج حاصل کرنے کے لیے قبل از انتخابات دھاندلی کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبے کے تحت انھوں نے آئینی ترامیم کا ایک پیکیج کسی دستوری اختیار کے بغیر نافذ کر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں منتخب اسمبلیاں خود مختار نہیں ہوں گی بلکہ انتخابات کے بعد بھی اصل اختیار غیر منتخب اداروں اور افراد کے پاس رہے گا۔ قومی سلامتی کونسل کا ادارہ جس میں تینوں افواج کے سربراہ اور ان کے سربراہوں کے ادارے کا چیف ورڈیوں والے چار جرنیل اور صدر (موجودہ صدر بری فوج کے سربراہ بھی رہنا چاہتے ہیں) اصل قوت ہوں گے۔ یہ ادارے اور صدر اسمبلیوں اور حکومت کو توڑنے اور برخاست کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اس طرح فوج کے مستقل طور پر سیاست میں ملوث اور دخیل رہنے کا راستہ ہموار ہو گیا ہے اور جو ملک ایک جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں حاصل کیا گیا تھا مستقل طور پر فوج کی عمل داری میں دے دیا گیا ہے۔ دستوری ترامیم کے مطابق صوبوں میں صدر کے نامزد گورنروں کا راج ہوگا۔ وہ اسمبلیوں کو اور صوبائی حکومتوں کو برخاست کر سکیں گے۔

ایسے حالات میں دینی جماعتوں کا اتحاد ”متحدہ مجلس عمل“ (MMA) روشنی کی ایک کرن ہے۔ یہ کرن مجلس عمل کی شریک جماعتوں کی قیادت اور کارکنوں کے اخلاص عمل اور قربانی سے روشنی کا مینار بن سکتی ہے۔ ”متحدہ مجلس عمل“ کی صورت میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دینی سیاسی جماعتوں نے آپس میں مل کر انتخابی اتحاد بنایا ہے۔ اس سے قبل مذہبی جماعتوں نے ملک کی دوسری جماعتوں سے مل کر ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کے

مقابلے میں پاکستان قومی اتحاد بنایا تھا جس کے سربراہ مولانا مفتی محمود مرحوم تھے اور جس کا نعرہ بھی نظام مصطفیٰ تھا۔ موجودہ مجلس عمل میں چھ مذہبی سیاسی جماعتوں، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمن)، جمعیت علمائے اسلام (سمیع الحق)، جمعیت علمائے پاکستان، مرکزی جمعیت اہل حدیث اور اسلامی تحریک پاکستان (سابق تحریک فقہ جعفریہ) نے آپس میں اتحاد کیا ہے اور مشترک منشور، مشترک دستور، مشترک تنظیم، ایک جھنڈے اور ایک انتخابی نشان کے تحت مل کر انتخاب لڑنے اور تمام معاملات میں مشترک موقف اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ بلاشبہ ایک ناقابل یقین پیش رفت (Break through) ہے۔ اس طرح کا اتحاد عوام کا دیرینہ مطالبہ تھا۔ اب مذہبی جماعتوں پر تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا الزام لگانے والوں کے منہ بند ہو گئے ہیں۔ شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث مکاتب فکر کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر متفق ہو جانا اور ان سفارشات کے نفاذ کے مطالبے کو اپنے منشور میں شامل کرنا ایک بابرکت اور اہم قدم ہے۔ اگر یہ اتحاد قائم و دائم رہے تو امت مسلمہ کے لیے بے شمار برکات اور خوش خبریوں کا حامل بن سکتا ہے۔ امت مسلمہ پر اس کے دُور رس خوشگوار اثرات کے پیش نظر اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے تمام شامل جماعتوں کے کارکنوں اور ان کی قیادت کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپس میں حقیقی محبت اور اعتماد پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہیں اور اتحاد و یکجہتی کے جذبے کو عوام الناس کے رگ و ریشے تک پہنچادیں۔

اتحاد کے جذبے کو عام کرنے کے لیے مشترک انتخابی مہم اہم ترین ذریعہ ہے۔ مشترک انتخابی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے درج ذیل اقدامات ضروری ہیں:



## قائدین کا ملک گیر دورہ:

چھ جماعتوں کے سربراہ مل کر پورے ملک کے طول و عرض کا دورہ کریں۔ تمام شریک جماعتیں مل کر اس کا پروگرام بنائیں۔ اس دورے کے دوران متحدہ مجلس عمل کا اللہ اکبر اور سبز ہلال والا سفید جھنڈا عوام کے دلوں پر نقش ہو جائے۔

## مشترک نعرے:

انتخابی مہم کے دوران ملک کے گلی کوچوں میں چھوٹے بڑے جلسوں اور جلوسوں میں ایسے نظریاتی اور پیغام کے حامل نعرے لگائے جائیں جو عوام کے دلوں کی آواز ہیں۔ اگر کہیں حاضرین میں ایسے نعرے لگ جائیں جس سے دوسروں کو اتفاق نہ بھی ہو تو برداشت اور حوصلے سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اختلافات کو دور کرنے کے لیے وقت حوصلہ اور صبر درکار ہے۔ آپس میں عفو و درگزر کے جذبے کے بغیر مہمات کو سر نہیں کیا جا سکتا۔

## مساجد کو مرکز بنانا:

”متحدہ مجلس عمل“ میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے نمائندے شامل ہیں اس لیے ملک بھر کی تمام مساجد کو اس تحریک کے مراکز کے طور پر کام کرنا چاہیے۔ دنیاوی سیاست کے علم بردار دینی جماعتوں کے کارکنوں اور علما و خطباء پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ مساجد کو سیاسی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست دوسرے دینی فرائض کی طرح ایک فریضہ ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کو مٹانے اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے اسلامی حکومت قائم کی تھی۔ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے انھوں نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا، ان کی تربیت کی، انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی، انھیں ہجرت اور جہاد پر آمادہ کیا اور طویل جدوجہد کے بعد اسلامی حکومت قائم کر دی جس کے

ذریعے قرآن کے احکام نافذ کیے اور عام انسانوں کو عدل و انصاف فراہم کیا۔ اس غرض کے لیے حضور نبی کریمؐ نے مسجد کو مرکز بنایا۔ مسجد کو اسلامی سیاست کا مرکز بنانا حضور نبی کریمؐ کی سنت ہے۔ اعتراض کرنے والے دین کے حقیقی تصور سے جس میں دین و دنیا کی تفریق نہیں آگاہ نہیں ہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ مسجد میں سیاسی حکمت عملی بیان کرتے وقت قرآن و سنت سے دلائل دیے جائیں۔ دوسروں کی دل شکنی اور دل آزاری سے پرہیز کیا چاہیے۔ دینی جماعت کے کارکن اور عام سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کے اخلاق میں نمایاں فرق ہونا چاہیے اور کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جو دینی تعلیمات کے دائرے سے باہر ہو۔

دفاتر کے علاوہ محلے کی مسجد کو بھی مجلس عمل کی انتخابی سرگرمیوں کا مرکز بنائیے اور تمام نمازیوں کو ان سرگرمیوں میں شرکت پر آمادہ کیجیے۔ یہ کام حکمت اور محبت کے ساتھ کرنے کا ہے۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو اسے محبت سے سمجھانے کی ضرورت ہے کہ یہ دنیا کا نہیں دین کا کام ہے۔ البتہ مسجد میں شور کرنے سے ہر صورت میں بچنا چاہیے اور لوگوں کی نمازوں اور عبادت، تلاوت قرآن اور درود و وظائف میں ہرگز مغل نہیں ہونا چاہیے۔

دین اور سیاست کی دوئی کے تصور کو ختم کرنا علمائے کرام کا فرض ہے۔ دینی جماعتیں اگر انتخابی مہم چلا رہی ہیں تو اسی وجہ سے چلا رہی ہیں کہ یہ ایک دینی فریضہ ہے۔ اسلامی حکومت کا قیام حضور نبی کریمؐ کی اہم ترین سنت ہے اور اس کے احیا میں امت کی زندگی ہے۔ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد اور انتخاب میں شرکت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لغدوة او روحة فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیہا

”اللہ کے راستے میں ایک صبح کا چلنا یا ایک شام کا چلنا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے“

انتخابی مہم میں کام کرنے کے لیے وقت نکالنا، جلسے جلوس میں شرکت کرنا اور ووٹروں تک مجلس عمل کا پیغام پہنچانا اللہ کے راستے میں چلنا ہے اور بلاشبہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ کارکنوں کو باہمی ربط بڑھانے کے لیے حضور نبی کریم کے اُمتی ہونے کا تصور پوری طرح ذہن نشین کرنا چاہیے اور اپنی دوسری حیثیتوں کو ثانوی درجہ دینا چاہیے۔ ”اللہ کی محبت اللہ کے رسول کی محبت اور اللہ کے راستے میں جہاد کی محبت“ وہ مشترک محبتیں ہیں جو ہمیں جوڑ کر رکھتی ہیں۔ دوسری کسی محبت کو ان محبتوں پر غالب نہیں آنا چاہیے۔ اگر ہم دوسری محبتوں کو ان بنیادی محبتوں پر ترجیح دیں گے تو اس کا نتیجہ دنیا و آخرت کی رُسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ بات اللہ رب العالمین نے مسلمانوں کو اس آیت میں اچھی طرح سمجھائی ہے:

”اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سامنے لے آئے“ (التوبہ: ۲۴)

عوام الناس کو بتایا جائے کہ ووٹ دینا ایک دینی فریضہ ہے۔ یہ حق کی گواہی ہے اور جب مسلمان کو حق کی گواہی دینے کے لیے بلایا جائے تو گواہی دینا اس کا فرض ہے۔ حق کی گواہی دینے سے احتراز کرنا دینی فریضے کو ادا کرنے سے احتراز اور حق کی گواہی چھپانا ہے۔ اللہ کا حکم ہے:

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ إِثْمٌ قَلْبُهُ ط (البقرہ ۲: ۲۸۳)

”گواہی مت چھپاؤ اور جو گواہی چھپاتا ہے تو اس کے دل میں گناہ ہے۔“

یہ شخص کو ووٹ دینا جو خود نا اہل اور فاسق ہے یا وہ ایسی پارٹی کے ساتھ ملا ہوا ہے



جس کی قیادت خیانت کرنے والے نااہل لوگوں پر مشتمل ہے، اپنی امانت نااہل کے سپرد کرنے کے متراف ہے۔ اس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ  
النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ط (النساء: ۵۸)

”مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔“

عوام الناس کو جاننا چاہیے کہ اگر وہ خود ووٹ دیتے وقت عدل اور انصاف نہیں کریں گے اور نااہل کو اختیارات کی امانت سپرد کر دیں گے تو اس کے نتیجے میں ظلم کا نظام برقرار رہے گا۔ پولیس بھی ظالم ہوگی، ڈی سی اور کمشنر بھی ظلم کرتے رہیں گے اور سیاست دان بھی لوٹ کھسوٹ جاری رکھیں گے اور تمام محکموں میں نااہل لوگ عوام کے ساتھ بے انصافی پر قائم ہوں گے۔ حالات میں تبدیلی اسی وقت ممکن ہے کہ عام ووٹر اپنے ووٹ کی پرچی کو امانت اور انصاف کے اصول کو مد نظر رکھ کر استعمال کرے۔ اگر ووٹ دیتے وقت عام آدمی خود عدل نہیں کرے گا تو اسے انصاف اور عدل کا نظام نہیں ملے گا۔

مختلف دینی جماعتوں کے کارکنوں کو مل جل کر تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والی مساجد میں نماز ادا کرنی چاہیے۔ ایک دوسرے کے ساتھ تحائف کا تبادلہ کرنا چاہیے۔ محبت اور اخلاص کے ساتھ ایک دوسرے کو سلام کرنا چاہیے اور آپس میں حسن ظن رکھنا چاہیے۔ ایک دوسرے پر بدگمانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ایک دوسرے کی عیادت کرنی چاہیے اور ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں شرکت کرنی چاہیے۔ باہمی ربط سے رخنہ ڈالنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر منبر و محراب سے ایک ہی آواز اٹھے اور یہ آوازیں آپس میں ہم آہنگ ہو جائیں تو کوئی دوسرا میڈیا ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ ہر گلی کوچے میں واقع مسجد کو مسلمانوں کا اجتماعی

اور سیاسی زندگی کو پاک کرنے کے مقدس فریضے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ مسجد اگر مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی اصلاح کی جدوجہد کا مرکز بن جائے تو اللہ کے باغی خیانت کار لوگوں کی سیادت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ووٹ دینے کے لیے فہرست میں اپنا نام ابھی سے معلوم کرنا، پولنگ اسکیم میں دلچسپی لینا، شناختی کارڈ ساتھ رکھنا اور اپنے پولنگ اسٹیشن کا پتہ کرنا ہر ووٹر کی اپنی ذمہ داری ہے۔ ایک ذمہ داری شہری اور ایک اچھے مسلمان کے طور پر اس ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ خواتین کے پولنگ اسٹیشن مردوں سے الگ محفوظ مقامات پر بنائے جائیں۔ مجلس عمل کے کارکنوں کو خواتین کے پولنگ اسٹیشنوں کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظامات کرنے چاہئیں۔ ابھی سے خواتین انتخابی کارکنوں کو تربیت دینے کی ضرورت ہے۔

”متحدہ مجلس عمل“ کا جو بھی امیدوار ہو اور اس کے نشان کتاب پر انتخاب لڑ رہا ہو اس کے لیے کام کرنا تمام جماعتوں کے کارکنوں کا فرض ہے۔ اگر ایک جماعت کو ملک کے ایک حصے میں ٹکٹ ملے ہیں تو دوسرے حصے میں دوسری جماعت کو حصہ ملا ہوگا اور یہ فیصلے قائدین نے مل جل کر کیے ہیں۔ تمام کارکنوں کو قائدین کے فیصلوں کا احترام کرنا چاہیے۔ ہم مشترک مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں اور کسی ایک کی کامیابی سب کی کامیابی ہے۔

اکتوبر کے انتخابی عمل پر ہمارے ملک کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ ایک جاندار انتخابی مہم کی صورت میں دھاندلی کے سارے منصوبے دھڑے کے دھڑے رہ جائیں گے۔ اگر عوام جوش و خروش سے انتخابی مہم کے دوران گھروں سے نکل آئے تو حکومتی مشینری کو قاعدے، ضابطے کے مطابق درست رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ ملک کے روشن مستقبل کا دارومدار پر امن اور پر جوش انتخابی مہم پر ہے اور اس بات پر ہے کہ ووٹر بڑی تعداد

۱۱۹ ————— مضامین قاضی حسین احمد

میں پولنگ اسٹیشن آئیں۔ یہ اس وقت ہوگا جب ووٹر کو اُمید کی کرن نظر آئے گی۔ انھیں انتخاب کے بہتر نتائج کی اُمید دلانا مجلسِ عمل کے کارکنوں کا اہم ترین فریضہ ہے۔ مجلس کے کارکن فتح کے یقین سے سرشار ہو کر کام کریں گے تب ہی دوسروں کو فتح کا یقین دلا سکیں گے اور عام ووٹر کے دل میں اُمید کی شمع روشن کر سکیں گے۔ پچھلے عام انتخابات میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف ۳۵ فی صد ووٹ پڑے تھے۔ اگر مجلس کے کارکنوں کی کوشش کے نتیجے میں ساٹھ ستر فیصد ووٹ پڑ جائیں تو ووٹ کی پرچی سے انقلاب یقینی ہو جائے گا۔ جو لوگ ووٹ کے لیے پولنگ اسٹیشنوں پر جانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے وہ دراصل کسی اچھی اور بڑی تبدیلی کی توقع نہیں رکھتے، اگرچہ وہ تبدیلی کے حامی ہوتے ہیں۔ اگر مجلسِ عمل کے کارکن لوگوں کو فتح اور بہتر تبدیلی کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں اور گھروں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے سینوں میں اُمید کی شمع روشن کر دیں اور مرد اور خواتین جوق در جوق دینی جذبے سے سرشار ہو کر اُمت کو پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف گامزن کرنے کے عزم لے کر نکل کھڑے ہوں تو ووٹ کی ہر پرچی ان شاء اللہ اسلامی انقلاب کی نوید بن جائے گی۔

(ستمبر ۲۰۰۲ء)



## بحرانی دور میں راہِ عمل

اس بارے میں دو آراء نہیں ہیں کہ پاکستان اور اُمتِ مسلمہ اس وقت ایک خطرناک بحرانی دور سے گزر رہے ہیں۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات نے اس بحران میں شدت پیدا کی ہے لیکن موجودہ صورت حال پیدا کرنے کا منصوبہ اس سے کافی عرصے پہلے کا بنا ہوا ہے۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد امریکہ اور مغربی دنیا کو نئے حریف کی تلاش ہوئی تو ان کے دانشوروں نے تہذیبوں کی جنگ کا نظریہ اختراع کیا۔ اس گھڑے ہوئے نظریے میں رنگ بھرنے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کو خون ریزی، دہشت گردی، انتہا پسندی اور نامعقولیت کے ساتھ وابستہ کرنے کے لیے ابلاغی حملہ (میڈیا وار) شروع کیا گیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر آلود پروپیگنڈا کیا گیا اور مغربی ذہن میں انھیں ہر طرح کی برائی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ تخریب کاری اور دہشت گردی کے ہر واقعے کو بلا تحقیق ان کے سر تھوپ دیا گیا اور مغربی ذہن کو اس طرح تیار کیا گیا کہ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ہر الزام کو انہوں نے بلا تحقیق بے چون و چرا قبول کر لیا۔

ان حالات میں جب ۱۱ ستمبر کو نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون پر حملہ ہوا تو فوری طور پر اس کا الزام ”القاعدہ“ کی نام نہاد تنظیم، اسامہ بن لادن اور طالبان پر لگا دیا گیا اور پاکستان کو ان کی پناہ گاہ ٹھہرا دیا گیا۔ چنانچہ ۱۳ ستمبر ۲۰۰۱ء کی رات کو امریکہ کے صدر بش نے دھمکی آمیز لہجے میں صدر پرویز مشرف سے ٹیلیفون پر استفسار کیا کہ کیا وہ دہشت گردی

کے خلاف جنگ میں تعاون کریں گے یا اکیسویں صدی میں ترقی کی منزلیں طے کرنے کے بجائے پتھر کے زمانے کی طرف لوٹنا پسند کریں گے؟ پرویز مشرف صاحب نے مہلت مانگے بغیر، ساتھیوں سے مشورے کے بغیر اور پڑوسی دوست ممالک کو مطلع کیے بغیر فوری طور پر وعدہ کر لیا کہ وہ ”دہشت گردی“ کے خلاف جنگ میں امریکہ کے اتحادی ہیں اور اسے لاجسٹک سپورٹ دیں گے (لا جسٹک سپورٹ میں امریکی فوجیوں کے قیام کی سہولتیں، ہوائی اڈوں کی اور دیگر ہر طرح کی سہولتوں کی فراہمی شامل ہے)۔ انھیں خفیہ معلومات فراہم کریں گے، یعنی ان کی خاطر جاسوسی کریں گے اور اپنی تمام معلومات انھیں مہیا کریں گے، نیز اپنی فضائیں ان کے ہوائی جہازوں اور میزائلوں کے لیے کھول دیں گے۔

یہاں سے ہماری بد قسمتی کا آغاز ہوا۔ ہماری مغربی سرحد پر غیر ملکی افواج کا قبضہ ہو گیا۔ ہم اپنے بھائیوں کے قتل میں شریک ہوئے۔ سالہا سال کی قربانیوں کے بعد پاکستان کے عوام اور حکومت نے افغانیوں کا ساتھ دے کر جو کچھ حاصل کیا تھا وہ خوف یا لالچ کے عوض پرویز مشرف صاحب نے ایک ہی ٹیلیفون کال پر تھج دیا۔

۱۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کو پرویز مشرف صاحب نے قومی قیادت کو ملاقات کے لیے محض یہ اطلاع دینے کے لیے بلایا کہ وہ پاکستان کی آزادی اور خود مختاری سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے پاکستان کو ممکنہ تباہی سے بچانے اور کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو جاری رکھنے اور بھارت امریکہ اتحاد سے بچنے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے۔

دینی جماعتوں کی قیادت نے بشمول جماعت اسلامی ان سے اتفاق نہیں کیا۔ ہم نے انھیں بتایا کہ وہ امریکی دھمکی اور طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اپنی آزادی اور خود مختاری سے دست بردار ہوئے ہیں۔ طالبان حکومت کے بعد انہیں مغربی سرحد پر ایک ناموافق صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انھیں بالآخر کشمیریوں کی جدوجہد کے ساتھ تعاون سے بھی

منع کر دیا جائے گا۔ ان کو نیوکلیر پروگرام سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے اور انھیں اسرائیل کو تسلیم کرنے پر مجبور کر کے ”دہشت گردی کے خلاف جنگ“ کے عنوان سے اُمتِ مسلمہ اور اسلامی تحریکوں کے خلاف امریکی اور صہیونی مہم جوئی کا شریک کار بنایا جائے گا۔

بد قسمتی سے بعد میں آنے والے حالات نے ہمارے خدشات کو درست ثابت کیا ہے۔ پاکستانی فوج کو عوام سے الگ تھلگ کرنے کے لیے بعض جہادی تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی۔ بغیر تحقیق کے ہر طرح کی تخریب کاری کا الزام پاکستان میں بھی جہادی تنظیموں پر لگایا جا رہا ہے حالانکہ پاکستان میں بھارتی ایجنسی ”را“ کی سرگرمیاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ ”را“ موساد اور امریکی ایجنسیوں کا باہمی تعاون بھی کوئی پوشیدہ امر نہیں ہے۔ پاکستان میں تخریبی کارروائی کے پیچھے ان ایجنسیوں کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس کا مقصد پاکستان میں ایف بی آئی اور امریکی خفیہ اداروں کے عمل دخل کو بڑھانا ہے۔ چنانچہ اخباری اطلاعات کے مطابق اس وقت تک پاکستان میں ایف بی آئی کے ایک سو سے زیادہ مراکز قائم ہو چکے ہیں اور اس سال ان کی تعداد کو ۵۰۰ تک بڑھانا مقصود ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف امریکی خفیہ ایجنسیوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف ان کا سفارتی اور تجارتی عملہ پاکستان سے نکل رہا ہے۔ دینی جماعتوں اور جہادی تنظیموں سے پاکستانی فوج کو الگ تھلگ کرنے کے علاوہ قبائلی علاقوں میں امریکی کمانڈو آپریشن اور بعض دینی مدارس پر چھاپوں میں پاکستان کے مسلح دستوں کے تعاون نے قبائل میں ناراضی پیدا کر دی ہے جو پاکستانی فوج کے لیے ”ریزرو فوج“ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حکومت اور فوج سے عوام قبائل، دینی تنظیموں اور جہادی قوتوں کو کاٹنے کی اس کوشش کے بعد امریکی اشیر باد پر بھارتی فوجیں ہماری سرحدوں پر چوکس کھڑی ہیں۔ بھارتی



پارلیمنٹ نے حکومت کو متفقہ طور پر پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے اشارے کے منتظر ہیں۔ بھارتی وزیراعظم واجپائی نے سری نگر پہنچ کر بھارتی فوجی دستوں سے خطاب کے ذریعے فیصلہ کن فتح تک جنگ کرنے کی دھمکی دے دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ کے وزیر خارجہ اور امریکی وزیر دفاع نے بھارت اور پاکستان کا دورہ کر کے حکومت پاکستان کے کشمیری مجاہدین کی مدد سے دستبردار ہونے اور کنٹرول لائن کے آر پار آنے جانے پر پابندی لگانے کا مطالبہ کر دیا ہے۔ بھارت، اسرائیل، امریکہ، برطانیہ کی اس ملی بھگت کے سامنے پرویز مشرف صاحب نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ کنٹرول لائن پر کشمیری مجاہدین کی آمد و رفت پر پابندی لگانا ان کی لائف لائن کو کاٹنے کے مترادف ہے۔ اگرچہ کشمیری مجاہدین کی جدوجہد مقبوضہ کشمیر کے عوام اور وہاں کے نوجوانوں کی مرہون منت ہے لیکن پاکستان کے عوام اور حکومت کا اخلاق اور قانونی فرض ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے لوگوں پر آزادی کشمیر کی سرحد بند کر دے۔ کنٹرول لائن کو تقدس فراہم کرنا اور اسے بین الاقوامی سرحد کی حیثیت دینا کشمیری عوام کے ساتھ بے وفائی ہے۔ کشمیریوں کے جس عزم و ہمت کو بھارت اپنی ۷ لاکھ مسلح افواج سے نہیں توڑ سکا اب بین الاقوامی دباؤ اور فوجی حملے کا خوف دلا کر وہ یہ کوشش کر رہا ہے کہ پاکستان کی حکومت اور فوج کو کشمیریوں کے اس عزم و ہمت کو توڑنے میں اپنا شریک کار بنالے۔ کشمیریوں کی مزاحمت کے خلاف بھارت کی کوششوں کا ساتھ دینا بدترین جرم ہوگا اور اگر پرویز مشرف حکومت اس کا ارتکاب کرتی ہے تو اسے اپنے قومی مفادات اور مصلحتوں کا سودا کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔

امن بلاشبہ انسانی ضرورت ہے۔ ایٹمی طاقتوں کے درمیان جنگ کا امکان ایک خوفناک صورت حال ہے لیکن کیا یہ خوف صرف ہم کو لاحق ہونا چاہیے اور اس خوف کے پیش نظر کیا ہمیں اپنی آزادی و خود مختاری اور کشمیر کے بارے میں اپنے برحق موقف سے دستبردار

ہو جانا چاہیے؟ اب تک پرویز مشرف حکومت نے دھمکیوں کے آگے سپر ڈال کر مسلسل قومی مفادات سے پسپائی اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ بھارتی وزیراعظم واجپائی نے واشگاف طور پر کہہ دیا ہے کہ جنگ لڑے بغیر ہم نے اپنے اہداف حاصل کر لیے ہیں۔ کیا اب تک کے واقعات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ امریکہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کو کوئی وقعت نہیں دے گا، چاہے ہم اس کی خوشنودی کی خاطر ہر ذلت کو گوارا کرنے پر تیار کیوں نہ ہو جائیں۔

ہماری ایٹمی قوت کا کیا فائدہ اگر اس کے ذریعے ہم بھارت کو جنگ سے باز نہ رکھ سکیں۔ اگر اپنی ایٹمی قوت کو بھی ہم امریکی زرغے میں دے دیں تو اپنی غلامی پر آخری مہر ثابت کر دیں گے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم قومی عزم اور قومی غیرت کو لٹکاریں۔ اس کے لیے فوج اور عوام میں حائل کی جانے والی خلیج کو مٹانے کی ضرورت ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ملک کی آزادی و خود مختاری اور اس کے اسلامی تشخص کو محفوظ کرنے اور دشمن کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے فوج اور عوام ایک ہو جائیں۔

خطرات کے اس ہجوم میں متحدہ مجلس عمل کا قیام اُمید کی ایک کرن ہے۔ آج سے ایک سال قبل اسلام آباد میں چھ جماعتوں کے سربراہوں نے ایک اعلان پر دستخط کیے اور اس کے ذریعے انھوں نے اندرونی اور بیرونی سازشوں کا مقابلہ کرنے اور پاکستان کی جغرافیائیں اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کا فیصلہ کیا۔

سب نے اتفاق کیا کہ مشترک بنیاد کے طور پر اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس طرح انھوں نے اس پروپیگنڈہ کا مثبت جواب دے دیا کہ مختلف مکاتب فکر کے لوگ کسی ایک موقف پر متحد نہیں ہو سکتے۔ یہ اتحاد الحمد للہ اب آگے بڑھ رہا ہے۔ مشترکہ دستور اور مشترکہ انتخابی منشور منظور ہو چکا ہے۔ مرکزی سطح کی تنظیم مکمل



ہو گئی ہے اور صوبائی اور ضلعی تنظیمیں ان شاء اللہ جولائی کے پہلے ہفتے تک مکمل ہو چکی ہوں گی۔ رابطہ عوام کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مینارِ پاکستان میں عظیم الشان کشمیر کانفرنس میں کشمیریوں کی جدوجہد آزادی اور جہاد کشمیر کے ساتھ یکجہتی کا اعلامیہ پڑھ کر سنایا گیا اور اس کی منظوری حاصل کی گئی۔ متحدہ مجلس عمل ان شاء اللہ دشمن کی کھڑی کی گئی تعصبات کی دیواروں کو گرانے کا سبب بنے گی۔ ان دیواروں کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ صدیوں تک اغیار نے انھیں پختہ کرنے اور مسلمانوں کو مستقل طور پر ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لیے ان دیواروں کو اونچا کرنے کا کام کیا ہے لیکن الحمد للہ بیداری کے اس دور میں ان لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو ان سازشوں کے مضمرات کو جانتے ہیں اور اتحاد کی برکات سے واقف ہیں۔ چیلنج اتنا بڑا اور خوفناک ہے کہ الگ الگ اس کا مقابلہ ناممکن ہے۔ لسانی، علاقائی، نسلی اور فرقہ وارانہ اختلافات سے بالاتر ہونے کے علاوہ امت مسلمہ کے لیے بچاؤ کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

خوش قسمتی سے عوام میں یہ شعور بیدار ہو چکا ہے اور اپنی جماعتوں کی قیادت اور ان کے کارکنوں پر عوام اتحاد کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ قیادت کے اندر خود بھی اتحاد کی ضرورت کا ادراک موجود ہے۔ چند سالوں کے باہمی رابطے کے نتیجے میں دینی زعماء میں باہمی اعتماد اور بے تکلفی پیدا ہوئی ہے۔ یہ بے تکلفی بدظنی کو ختم کرنے اور حسن ظن پیدا کرنے کا موجب بنی ہے۔ مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں ان شاء اللہ یہ حسن ظن کارکنوں تک پہنچ جائے گا اور انتخابی مہم میں ایک نشان کے تحت شریک ہونے کے نتیجے میں دینی جماعتوں کا ایک متحدہ تشخص ابھرے گا۔ ان شاء اللہ اس مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں علاقائی اور تعصبات ماند پڑ جائیں گے۔

اس کے لیے دینی جماعتوں کی قیادت کے ساتھ ساتھ کارکنوں پر بھی بھاری ذمہ



داری عائد ہوتی ہے کہ وہ آپس میں گہرے دوستانہ روابط قائم کریں۔ ایک دوسرے کی مساجد، مدارس اور نشست گاہوں میں بلا روک ٹوک آمد و رفت جاری رکھیں، باہمی تحفے تحائف کا تبادلہ کریں اور مشترک موضوعات پر گفتگو کے ذریعے خوشگوار ماحول پیدا کریں۔ اختلافی موضوعات پر گفتگو سے احتراز کریں۔ ایک دوسرے کی عیادت کریں، تعزیت کی مجالس میں شرکت کریں اور عوام الناس کو اتحاد کی برکات سے آگاہ کریں۔

اس موقع پر مشرف حکومت کو متحدہ مجلس عمل کی قیادت کے ساتھ درج ذیل ایجنڈے پر کھلے دل سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہیے:

☆ آئین پاکستان کی بحالی، جو اسلام، پارلیمانی جمہوریت، بنیادی حقوق، مرکز اور صوبوں میں اختیارات کی تقسیم (وفاقیت) اور صدر اور وزیراعظم کے درمیان اختیارات کی تقسیم کی متفق علیہ قومی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

☆ اس آئین میں رد و بدل سے احتراز کیا جائے۔

☆ نیشنل سیکورٹی کونسل قائم کرنے کے خیال کو ترک کر دیا جائے۔

☆ آزادانہ انتخابات کرانے کے لیے الیکشن کمیشن کی از سر نو تشکیل کی جائے۔

☆ کشمیری مجاہدین کا ساتھ دیا جائے اور کشمیر پالیسی میں تبدیلی سے گریز کیا جائے۔

☆ پاکستان میں امریکی فوجی اڈے اور امریکی ایف بی آئی کے مراکز ختم کر دیے جائیں۔ ذرائع ابلاغ کی اصلاح کی جائے اور انھیں اسلامی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے۔

☆ نصاب تعلیم میں رد و بدل کرنے کے غیر ملکی دباؤ کو مسترد کیا جائے اور تعلیم کو اسلامی نظریے سے مکمل طور پر ہم آہنگ کر دیا جائے۔

☆ پرویز مشرف صاحب چیف آف اسٹاف آرمی کا عہدہ اپنے کسی معتمد ساتھی کے

حوالے کر دیں۔

☆ حاضر سروس فوجی افسران کو فوجی ڈیوٹیاں سرانجام دینے کے لیے واپس بلا لیا جائے۔

اگر پرویز مشرف صاحب اس ایجنڈے پر متحدہ مجلس عمل کی قیادت کے ساتھ متفق ہو جائیں تو ملک و قوم کو درپیش چیلنج کا ان شاء اللہ مل کر مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح انھیں قوم کا خوشدلانہ تعاون حاصل ہو سکتا ہے اور ہم بیرونی سازشوں کا شکار ہونے سے بچ سکتے ہیں۔ اس سے فوج اور عوام میں افتراق پیدا کرنے کی سازشیں دم توڑ دیں گی اور پاکستان اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر حصار بن کر ابھرے گا۔

افغانستان کے حالات میں بھی ایک پہلو سے ہمارے لیے رہنمائی ہے۔ وہاں حال ہی میں لویہ جرگہ منعقد کیا گیا ہے۔ امریکی ڈالروں اور سنگینوں کے سائے میں منعقد ہونے والا یہ جرگہ ایک تماشہ تھا۔ اگرچہ علامہ اقبالؒ نے تو مغربی جمہوری نظام کو بھی تماشہ قرار دیا تھا:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہیں چنگیزی

اقبال کا منشا یہ تھا کہ انسان کو جو چیز ظلم سے باز رکھتی ہے وہ اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود کی پابندی ہے۔ افغانستان میں طالبان نے بساط بھر کوشش کی تھی کہ حق حکمرانی کو شریعت کی حدود کا پابند بنادیں۔ اس سے وہاں عدل و انصاف قائم تھا جس کا پھل جان، مال اور عزت و آبرو کا تحفظ تھا۔ طالبان کے زیرِ کنٹرول علاقے میں مثالی امن قائم ہو گیا تھا۔

افغان معاشرے میں مسجد اور ملا کو مرکزیت حاصل ہے۔ طالبان حکومت کو مسجد اور ملا

کی پشت پناہی حاصل تھی۔ یہ ادارہ ملک کے دور دراز علاقوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر محلے اور ہر گلی کوچے میں مسجد، امام، خطیب، مدرسہ، طالب علم اور ان کے متعلقین کا جال بچھا ہوا ہے۔ طالبان کے دور حکومت کے مثالی امن کا بنیادی سبب مسجد اور ملا، امام و خطیب و مقتدی کے اس روحانی نظام اور حکومت کے درمیان مضبوط رابطہ تھا۔ ڈالروں اور سنگینوں کے زیر سایہ جو حکومت قائم ہوگی وہ اس ادارے کے خوش دلانہ تعاون سے محروم ہوگی۔ اس وقت افغانستان میں شدید افراتفری اور بد امنی پھیل گئی ہے۔ چند بڑے شہروں پر غیر ملکی فوج کا قبضہ ہے۔ ملک کے طول و عرض میں ڈاکوؤں کا راج ہے۔ غیر ملکی قابض افواج کے خلاف آئے دن کارروائیاں ہو رہی ہیں اور اصلاح احوال کی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ جب تک ملک کے علماء اور روحانی قیادت کو دوبارہ اعتماد میں نہیں لیا جائے گا اس وقت تک کسی موثر حکومت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

پاکستان میں بھی علماء و مشائخ اور مسجد و مکتب کا یہ نظام موجود ہے۔ اگرچہ اس کا اثر و رسوخ اتنا ہمہ گیر نہیں ہے جتنا کہ افغانستان میں ہے، تاہم اگر حکومت کی سرپرستی انھیں حاصل ہو جائے اور یہ حکومت سے خوش دلانہ تعاون کے لیے تیار ہو جائیں تو امن و امان کا مسئلہ، تعلیم و تربیت کو عام کرنے کا مسئلہ، بستیوں اور گلی کوچوں کی صفائی کا مسئلہ اور لوگوں کو بنیادی ضروریات فراہم کرنے کا مسئلہ حکومت اور مسجد و مکتب کے تعاون سے حل ہو سکتا ہے۔ یہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے متحدہ مجلس عمل کا قیام ایک اہم پیش رفت ہے۔

متحدہ مجلس عمل کو ایک ہمہ گیر قومی پلیٹ فارم بنانے کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔ اس میں اگر ایک طرف اعلیٰ ماہرین اور نیک نام سماجی اور سیاسی شخصیتوں کو شامل کرنا ضروری ہے تو دوسری طرف ان علماء و مشائخ کا خوش دلانہ تعاون حاصل کرنا بھی ضروری ہے جو اس میں شامل کسی بھی جماعت کے دائرے میں شامل نہیں ہیں۔ اس طرح کے ماہرین اور علماء و



مشائخ کو شامل کرنے کے لیے راستہ نکالنا اور انھیں قیادت میں جگہ دے کر وسیع مشاورت میں شامل کرنا اصلاح احوال میں مفید ہوگا۔

خواص اور مختلف فنون کے ماہرین کے علاوہ عوام الناس کے ساتھ قریبی رابطہ قائم کر کے انھیں ووٹ دینے پر آمادہ کرنا اس مفروضے کو توڑنے کے لیے ضروری ہے کہ عوام دینی جماعتوں کو حکومت قائم کرنے کے لیے ووٹ نہیں دیتے، اگرچہ ان کی ایک تعداد مختلف ایشوز کے حوالے سے ان کے کہنے پر سڑکوں پر آ جاتی ہے۔ اس مفروضے کو توڑنے کے لیے گھر گھر انتخاب کے حوالے سے رابطہ کرنا، انتخابی منشور کو ایک ایک فرد تک پہنچانا اور اسلامی نظام کی برکات سے لوگوں کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔

مینارِ پاکستان پر منعقدہ ۱۶ جون ۲۰۰۲ء کی کشمیر کانفرنس نے جمود توڑ دیا ہے۔ عوام جس بڑی تعداد میں اس میں شریک ہوئے ہیں اس کی مثال گزشتہ ۲۰ سال کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ملکی معاملات سے لوگوں کی عدم دلچسپی اور لاطعلقی اصلاح کے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لاطعلقی کو دور کرنے کے لیے دینی حوالے سے قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کو تحرک کی برکات سمجھانے کی ضرورت ہے۔

اللہ رب العالمین کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَثَّا  
قُلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۖ أَرْضِيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۖ فَمَا مَتَاعُ  
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا  
أَلِيمًا ۖ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ

شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (التوبہ: ۹، ۳۸، ۳۹)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی

راہ میں نکلنے کے لیے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سرو سامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (التوبہ: ۹۱)

”نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔“

حضور نبی کریم کا ارشاد گرامی ہے:

لَعَذْوَةٌ أَوْ رَوْحَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا

”اللہ کے راستے میں صبح کا ایک چلنا یا شام کا ایک چلنا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔“

لوگوں کی اصلاح اور قومی مفاد کی خاطر اور ظلم کا نظام مٹانے اور عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کی خاطر لوگوں کی مایوسی دور کرنے اور ان کے سینوں میں اُمید کا چراغ روشن کرنے کے لیے سعی وجہ کا دنیا میں بھی اجر ملے گا اور آخرت میں بھی۔ یہی تحریک بیداری پیدا کرنے کا سبب بھی بنے گا۔

اس وقت دینی جماعتوں کے اتحاد کے ذریعے تمام مسجدوں کے دروازے تمام دینی جماعتوں کے کارکنوں کے لیے کھل گئے ہیں۔ ائمہ اور خطبا کے لیے موقع ہے کہ آپس کے روابط کو مزید گہرا کریں۔ دینی جماعتوں کے کارکنوں کا بھی فرض ہے کہ اس موقع کا بھرپور

فائدہ اٹھالیں اور عوام الناس کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے اپنا فرض ادا کریں۔  
 جہاد کا حقیقی مفہوم عدل و انصاف کے قیام کے لیے مسلسل حرکت میں رہنا ہے۔ جہاد  
 مسلمان کا طریق زندگی ہے۔ الجہاد ماضی الی یوم القیمۃ جہاد قیامت تک جاری  
 رہے گا کا یہی مفہوم ہے۔ بیدل کا مشہور شعر ہے:

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست

ما زندہ ازا نیم کہ آرام نہ گیریم

ہم ایسی موجود کے مانند ہیں کہ اگر ٹھیر جائیں تو معدوم ہو جائیں۔ ہماری زندگی کا راز  
 مسلسل حرکت میں ہے۔

آمرانہ نظام قائم کرنے کے خواہشمند فوجی جرنیل خاموش اکثریت کا حوالہ دے کر یہ  
 ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سیاسی اور دینی جماعتوں کو قوم کی حقیقی نمائندگی حاصل نہیں، کیونکہ  
 قوم کی بڑی اکثریت خاموش ہے۔ اس ”خاموش اکثریت“ کی خاموشی کو توڑنے کی  
 ضرورت ہے جو اپنی بے عملی کو چھپانے کے لیے یہ جملہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم سیاست میں نہیں  
 ہیں۔ سیاسی امور سے لاتعلقی کا مطلب قومی امور سے اور اصلاح احوال کی کوشش سے  
 لاتعلقی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے معاشرے کی اصلاح کی خاطر اجتماعی فریضے میں  
 اپنا حصہ ادا کرنے سے لاتعلقی کا اعلان کوئی خوبی نہیں بلکہ عیب ہے۔ سیاسی معاملات سے  
 عدم دلچسپی ایک ایسا روگ ہے جو ہماری قومی زندگی میں سرایت کر چکا ہے۔ اگرچہ اس کے  
 ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے فریب، جھوٹ اور مکر کو سیاست کا نام دے دیا ہے لیکن عوام  
 الناس کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ سیاست قومی معاملات کی اصلاح کا نام ہے اور یہ  
 ایک اجتماعی دینی فریضہ ہے۔ اسلامی حکومت کا قیام حضور نبی کریم کی سنت ہے اور اسلامی  
 حکومت کے قیام کی کوششوں میں ہر مسلمان کو شریک ہونا چاہیے۔



مضامین قاضی حسین احمد ————— ۱۳۲

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است      آبروئے مازنامِ مصطفیٰ است  
در شبستانِ حرا خلوتِ گزید      قوم و آئین و حکومتِ آفرید  
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد      ہنجو او بطنِ اُمِ گیتی نژاد

”مسلمان کے دل میں مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت رچی بسی ہے۔ ان کی نسبت سے ہماری آبرو قائم ہے۔ انھوں نے حرا کی تاریکیوں میں خلوت اختیار کی تو وہاں سے نکل کر قوم و آئین اور حکومت بنائی۔ انھوں نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔ اس کائنات میں ان کی سی شان والا کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔“

دین و سیاست الگ نہیں ہیں بلکہ دین دنیا کی زندگی گزارنے کا سلیقہ ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے جنھوں نے جہدِ مسلسل کے ذریعے اسلامی حکومت قائم کر کے عدل و انصاف کا بول بالا کیا۔

(جولائی ۲۰۰۲ء)

## تعلیم و تربیت اور جہاد کا وسیع تصور

انسان کی طبعی کمزوریوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی متعدد آیات میں کیا ہے۔ یہ طبعاً حریص ہے اور بخیل ہے۔ خواہشاتِ نفس اور ترغیباتِ نفسانی کی طرف کھینچ جاتا ہے اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود کو بھی پھلانگ جاتا ہے۔ انسان جلد باز ہے۔ دُور کے فائدے کی بجائے نظر آنے والے فوری فائدے اور نفع کی طرف لپکتا ہے۔ اجتماعی اور ملی فائدے کے بجائے ذاتی فائدے کو وقعت دیتا ہے۔

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (الاحزاب: ۷۲)

”بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔“

وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا (الانساء: ۲۸)

”کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔“

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ

الْخَيْرُ مُنُوعًا (المعارج: ۱۹-۲۱)

”انسان تھڑ دلا پیدا کیا گیا ہے جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے

اور جب اسے خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔“

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ط (الانبیاء: ۳۷)

”انسان جلد باز مخلوق ہے۔“

كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۝  
وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

(الفجر ۸۹:۱۷:۲۰)

”ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اُکساتے اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔“

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں انسان کے اس طبعی بخل اور مال کے حرص کا ذکر کیا ہے اور اس کی تباہ کاریوں کی طرف متوجہ کیا ہے اور ان کا علاج کرنے کے لیے انسان کو دنیا و مافیہا سے ماورا بلند مقاصد اور ذاتی کی بجائے اجتماعی مقاصد کی طرف ترغیب دلائی ہے۔

ترغیبات نفسانی میں مال کی حرص، جنسی حرص اور اقتدار کی حرص بنیادی ترغیبات ہیں۔ قرآن نے دنیا کی زندگی کو زینت، ایک دوسرے پر فخر کرنے اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے سے تعبیر کیا ہے:

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُمْ زِينَةٌ وَتَفَاخُرُهُم بَيْنَكُمْ  
وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ط (الحديد ۵:۲۰)

”خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمھارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔“

قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کمزوریوں کی نشاندہی کے ساتھ



ان کے مضر اثرات سے بچنے اور ان طبعی میلانات کو مثبت اور بلند مقاصد کے حصول کی طرف موڑنے کا عملی راستہ دکھایا گیا ہے۔ اس کے برعکس مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب نے انسان کی اس طبعی حرص اور بخل اور زینت و تفاخر اور تکاثر اور ترغیبات و خواہشات نفس کو ہمہ گیر لگا کر انسان کو ان کی خاطر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور مادی سہولتوں کے حصول کی خاطر محنت کرنے کا عادی بنایا ہے۔ چنانچہ ان کا مشہور مقولہ ہے Work like donkey and eat like king گدھے کی طرح محنت کرو اور بادشاہ کی طرح کھاؤ۔

بعض لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام چونکہ ترغیبات و تحریصات کو ہمہ گیر لگا کر زیادہ محنت پر آمادہ کر کے جسمانی اور ذہنی قویٰ کو حرکت دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسلامی تعلیمات قناعت اور زہد اختیار کرنے کی تلقین پر مشتمل ہیں اس لیے مادی طور پر مغرب نے ترقی کی ہے اور مسلمان پسماندہ رہ گئے ہیں۔

اسلامی معاشیات پر کام کرنے والے مسلمان معاشی مفکرین کا فرض ہے کہ اس مسئلے کے حل کی طرف توجہ دیں اور ان بنیادی معاشی ترغیبات کی نشاندہی کریں جن کی بنا پر مسلمان زیادہ مفید پیداواری محنت پر آمادہ ہو سکیں۔ معاشی ترقی قوت ہے اور قوت کے بغیر مسلمانوں کی موجودہ پستی دُور نہیں ہو سکتی۔ حقیقی آزادی کے لیے معاشی احتیاج سے نکلنا لازمی ہے۔ آزادی اور احتیاج ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ قومی خود مختاری (Sovereignty) کے لیے معاشی خود کفالت حاصل کرنا لازم ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے دشمن سے مقابلے کے لیے گھوڑے تیار رکھنے کا حکم دیا ہے (الانفال ۸: ۶۰) یہ ہدایت بنیادی طور پر جنگی قوت سے متعلق ہے لیکن آج کے دور میں جنگی قوت علمی اور معاشی قوت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اخلاقی قوت، علمی قوت اور معاشی قوت ایک مضبوط دفاعی قوت کے لیے لازم ہیں۔ اسی آیت کے دوسرے حصے

میں اس تیاری کے حکم کے معاً بعد اس ارشاد و مَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ” اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔“ (الانفال ۸: ۶۰) میں ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جہاد کی اس تیاری کے لیے اتفاق ضروری ہے اور اتفاق مالی استعانت اور معاشی قوت پیدا کیے بغیر محال ہے۔ مقابلے کی کم از کم قوت کے لیے مقابلے کے عسکری اور مالی دونوں ہی وسائل دین اور اہل دین کی ضرورت ہیں۔

اگر مسلمان مرد و عورتیں اور نوجوان نسل اس بنیادی جذبے سے سرشار ہو جائیں کہ انھوں نے دنیا میں عدل و انصاف کی سر بلندی، اعلائے کلمۃ اللہ اور انسانیت کی رہنمائی کے لیے قوت حاصل کرنی ہے تو وہ ذاتی حرص اور ترغیبات نفسانی کے منفی اثرات سے بچ سکتے ہیں۔ ان کے ذاتی تقویٰ، قناعت اور زہد و ورع میں بھی کمی نہیں آئے گی اور وہ علمی اور معاشی میدان میں بلند تر مقصد کے لیے مادہ پرستوں سے آگے بڑھ کر زیادہ محنت اور جانفشانی سے کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ حقیقت میں جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کو اس وسیع تر مفہوم میں سمجھنے سمجھانے اور اسے اسلامی تعلیم و تربیت کا ایک لازمی حصہ بنانے کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں متعدد مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ آپؐ نے جاہلی جذبات کو خدا پرستی اور اللہ سے محبت کی طرف موڑا ہے۔ ایام جاہلیت میں حج کے موقع پر عرب قبائل اپنے اپنے شعرا کے ساتھ شرکت کرتے تھے اور اپنے آباء و اجداد کے کارنامے بیان کر کے ان پر فخر کرتے تھے۔ اللہ نے حکم دیا کہ جس طرح تم اپنے آباء و اجداد کا ذکر کرتے تھے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اللہ کا ذکر کرو۔

۱۳۷ — مضامین قاضی حسین احمد

فَإِذَا قُضِيَتْ مَنَاسِكُكُمْ فَادْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ  
ذِكْرًا (البقرہ ۲: ۲۰۰)

”پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے اسی طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔“  
قبائلی تفاخر کو اللہ کے راستے میں جہاد اور قربانی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے استعمال کیا۔ اللہ کی رضا اور جنت کی نعمتوں کے حصول کے لیے اللہ کے راستے میں جہاد کو ذریعہ قرار دیا اور فرمایا:

وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ (المطففين ۸۳: ۲۶)

”جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔“

قناعت اور زہد کا یہ تصور سراسر غیر اسلامی ہے کہ مسلمان محنت نہ کرے۔ قناعت کا حقیقی تصور یہ ہے کہ محنت کر کے کمائے بقدر ضرورت اپنے لیے رکھے اور باقی معاشرے کے ضرورتمندوں اور اجتماعی مفاد کی طرف لوٹا دے۔ پشتو کے مشہور صوفی شاعر رحمن بابا کا ایک شعر ہے:

دولبر و صدقے لرہ غواژم

بسے نہ چہ پے دنیا پے زہیریم

”میں دنیا کا حریص نہیں ہوں۔ اس کی طلب اس لیے کرتا ہوں کہ اسے محبوب مقاصد کی خاطر صدقہ کر سکوں۔“

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ہی مصرعے میں دین اور دنیا کو کس خوبصورتی کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”از کلید



دیں در دنیا کشاد، انھوں نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا، یعنی دین الگ اور دنیا الگ نہیں ہے بلکہ دین دنیا کی زندگی گزارنے کا سلیقہ ہے۔ بھلا جو دنیا کی زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے وہ کیونکر یہ تعلیم دے سکتا ہے کہ دنیاوی ترقی کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ یہ تو بنیادی تعلیم ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلیٰ ”اسلام بالادستی چاہتا ہے دوسرے نظاموں کی بالادستی قبول نہیں کرتا“۔

مسلمانوں کے معاشی مفکرین کا فرض ہے کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی ترغیبات کے مقابلے میں اسلامی تصورات عالمی سطح پر شرح و بسط سے پیش کریں۔ اس وقت عالم اسلام میں بیداری کی لہر ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ اس حد تک بیدار ہو گیا ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں جان کی قربانی اور شہادت کی موت کے لیے آمادہ ہیں۔ اس جذبے کو صحیح سمت دینے کی ضرورت ہے اور مسلمان نوجوانوں کو اسلام کی خاطر مرنے کی تمنا کے ساتھ ساتھ اسلام کی خاطر جینے کا سلیقہ سکھانے کی ضرورت ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے اللھم احیننی سعید او امتنی شہیداً اے اللہ! مجھے سعادت کی زندگی و شہادت کی موت عطا فرما، زندگی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس کی قدر کرنا مسلمان کا فرض ہے۔ اس کی صحیح قدر کرنا یہی ہے کہ اس کے ایک ایک لمحے کو مفید مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ اپنے اوقات کو کسی مفید کام میں صرف کرنا وقت کو ضائع ہونے سے بچانا ہے۔ مفید کام کا دنیوی فائدے کے ساتھ آخرت میں بھی اجر ملے گا۔ یہ بات اس حدیث سے اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص ایک پودا زمین میں لگانے کے لیے بیٹھا ہو اور اتنے میں قیامت قائم ہو جائے لیکن تمہارے پاس اتنی مہلت ہے کہ پودا زمین میں لگا کر کھڑے ہو جاؤ تو پودا لگا دو کیوں کہ اس پر تمہیں اجر ملے گا۔ یعنی دنیا کا ایک ایک لمحہ اتنا قیمتی ہے اور اس کا استعمال آخرت کے اجر کے لیے اتنا مفید اور ضروری ہے کہ تمہیں معلوم ہے کہ

قیامت قائم ہوگئی ہے اب اس پودے کی نشوونما کا کوئی موقع نہیں ہے لیکن دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے اس لیے کاشت کے موقع کو ضائع نہ کرو۔ پھل آخرت میں ملے گا۔ (الدنیا مزرع الآخرة)

آج جہاد اور شہادت کے جذبے سے سرشار مسلمان نوجوان کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اس وقت اگر مغربی تہذیب کو غلبہ حاصل ہے تو اس کی پشت پر صدیوں کی منصوبہ بندی، باہم مربوط کوششیں، آزادانہ علمی اور سائنسی تحقیق، سائنسی اور علمی اداروں کا قیام، یونیورسٹیوں کا قیام، مشترک قومی مقاصد کا تعین اور ان کے حصول کی خاطر فروغی اور گروہی اختلافات سے بالاتری اور اس قبیل کی تدابیر کی قوت کا رفرما ہے۔ بلاشبہ مغربی تہذیب میں اپنے نکتہٴ عروج کو چھونے کے بعد زوال کے آثار پائے جاتے ہیں کیونکہ اس کی اخلاقی بنیادیں کمزور ہیں لیکن اس وقت مسلمانوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس کی جگہ لے سکیں۔ محض تخریب اور دوسروں کو نقصان پہنچانے سے ہم انسانیت کے لیے رشد و ہدایت کا ذریعہ نہیں بن سکتے، نہ وہ بلند مقاصد حاصل کر سکتے ہیں جن کے لیے امت مسلمہ اُٹھائی گئی ہے۔ اس کے لیے جہاد فی سبیل اللہ اور شہادت کے جذبے اور تمنا کو عمل میں ڈھالنے کے لیے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔ ان تدابیر میں معاشی خود کفالت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ اس کے لیے اسلامی ممالک کی معاشی منصوبہ بندی کرنے والوں کو نئے راستے اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے ان کی تشفی ضروری ہے کیونکہ ان کی تربیت مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ہوئی ہے اور وہ اس سے آگاہ نہیں ہیں کہ مغربی معاشی تصور میں انسان کی حرص اور بھوک کو بڑھا کر جس طرح اسے زیادہ محنت پر آمادہ کیا جاتا ہے، اسلام کے پاس اس سے بہتر راستہ ہے جس سے مسلمان کو اخلاقی، علمی اور مادی کاوش اور قربانی کے لیے آمادہ کیا جاسکتا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس پورے تصور کو ہمارے تربیتی اور تعلیمی نظام کے لیے بنیادی جزو کے طور پر متعارف کرایا جائے۔ صدیوں کے انحطاط سے دین اسلام کے بنیادی پہلو نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور رہبانیت ترک دنیا اور اس کے مختلف مظاہر کو ولایت اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کا اصل ذریعہ جہاد فی سبیل اللہ کے وسیع تر مفہوم کے ساتھ ہر طرح کی اخلاقی، علمی اور مادی و معاشی کاوش ہے، مسلمانوں کی روحانی، اخلاقی اور مادی ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

(جنوری ۲۰۰۲ء)



## قومی بیداری — وقت کا تقاضا

جنرل پرویز مشرف نے جواب چشم بدو و رد بھی بن گئے ہیں، اپنی پہلی تقریر میں جو سات نکاتی ایجنڈا قوم کے سامنے رکھا تھا، اس کا پہلا نکتہ ”قومی اعتماد کی بحالی“ تھا۔ قومی اعتماد کی بحالی کو اولیں ترجیح قرار دے کر درحقیقت یہ اعتراف کیا گیا تھا کہ قوم مایوسی کا شکار ہے۔ اگر رسول اور ملٹری انٹیلی جنس کے متعدد محکمے دیانتداری سے اپنی رائے جنرل صاحب کے سامنے باقاعدہ پیش کر رہے ہوں تو ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہونی چاہیے کہ ان کے حکمران بننے کے بعد قوم کی مایوسی میں اضافہ ہوا ہے، کمی نہیں ہوئی۔

جنرل صاحب کے سات نکاتی ایجنڈے کا دوسرا جزو ”وفاق کی مضبوطی“ تھا۔ وفاق کی مضبوطی سے مراد یہ ہے کہ وفاق کے اجزا کے طور پر تمام صوبے اپنے اپنے دائرہ کار میں خود مختار ہوں، ان کے آپس کے تعلقات باہمی اعتماد، بھائی چارے اور محبت پر استوار ہوں۔ وہ وفاقی حکومت کے زیر سایہ ہم آہنگ ہو کر مشترک مقاصد کے لیے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہوں۔ بد قسمتی سے صورتحال اس کے برعکس ہے۔ خشک سالی اور آبی ذخائر میں پانی کی کمی کے باعث زرعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پانی کے بحران میں صوبوں کے اختلافات بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ اخبارات کی زینت بنے ہیں۔ طرفہ تماشایہ ہے کہ سرکاری ملازمین کے ذریعے صوبوں کے مفادات کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ کبھی صوبہ پنجاب کے خلاف تین صوبے مشترکہ مفادات کی کونسل سے واک

آؤٹ کرتے ہیں اور کبھی سندھ پر پانی چوری کا الزام لگا کر پنجاب اور سرحد بلوچستان کی حمایت میں اجلاس سے واک آؤٹ کرتے ہیں۔ یہ خبریں جب اخبارات کی زینت بنتی ہیں تو صوبوں کے علیحدگی پسند عناصر کی تقویت کا باعث بنتی ہیں اور وہ بھی خم ٹھونک کر میدان میں نکل آتے ہیں۔ علاقائی پریس عوامی احتجاج میں مزید تلخی گھولنے کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح وفاق کے مختلف یونٹ (صوبے) فوجی حکمرانوں کی غفلت اور نااہلی کے سبب سرکاری افسران کے ذریعے آپس میں حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں اور وفاق کی تقویت کے بجائے اس کی کمزوری کا باعث بن رہے ہیں۔

افواج پاکستان کے سربراہ اس وقت مطلق العنان صدر کی حیثیت سے تمام اختیارات کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ یہ امر بذات خود صوبوں کے اختیارات کو سلب کرنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے اور صوبوں میں بد اعتمادی کا سبب بن رہا ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے ایجنڈے کا تیسرا نکتہ ”معیشت کی بحالی“ ہے۔ معیشت کی حالت زار کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس وقت گرتی ہوئی معیشت ہی ہماری سب سے بڑی کمزوری بن گئی ہے اور اس کی وجہ سے ہماری آزادی خطرے میں ہے۔ ہم خارجہ امور، دفاع اور معاشی پالیسیوں کے علاوہ تعلیم جیسے اہم شعبے میں بھی آزادی سے محروم ہو گئے ہیں۔ نصاب تعلیم میں نیو ورلڈ آرڈر کے ایجنٹوں کی مرضی کے مطابق رد و بدل پر مجبور ہیں۔ دینی مدارس کے خلاف حکومت کی محاذ آرائی اور میٹرک کے نصاب سے قرآن کریم کے ترجمے کا حذف کرنا بیرونی دباؤ کا ہی نتیجہ ہے۔ سرکاری ملازمین کی سالانہ کانفیڈنشل رپورٹوں سے دینی اور اخلاقی حالت اور نظریہ پاکستان سے وابستگی سے متعلق سوالوں کا اخراج بھی معنی خیز ہے اور حکومت کے رجحان میں تبدیلی کا واضح اشارہ ہے جس میں نہ معلوم کس کس کا ہاتھ ہے۔ اس وقت کشمیر کے مسئلے میں بعض حکومتی حلقوں کی طرف سے لچک کے جو اشارے

۱۳۳ ————— مضامین قاضی حسین احمد

دیے جا رہے ہیں وہ بھی معاشی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ حکومت اپنے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود معیشت کو سنبھالا دینے میں ناکام رہی ہے اور کوئی ایسا انقلابی قدم نہیں اٹھا سکی ہے جس سے معاشی صورت حال میں کوئی حقیقی تبدیلی واقع ہو سکے۔ مہنگائی، بے روزگاری اور قرضوں پر انحصار میں مسلسل اضافہ اس دور کی نشانی بن گئے ہیں اور ملک پر عالمی ساہوکاروں کا تسلط مستحکم تر ہوتا جا رہا ہے۔

ایجنڈے کا چوتھا نکتہ ”امن و امان کی بحالی“ ہے لیکن دہشت گردی، قتل، ڈاکا زنی، چوری، عمارتوں کی بے حرمتی اور دوسرے جرائم کا گراف مسلسل بڑھ رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے ناجائز اسلحہ ضبط کرنے اور تعاون نہ کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دینے کی محض دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اگر حکومت شہریوں سے اسلحہ لینے میں قدرے کامیابی حاصل بھی کر لیتی ہے تو یہ کامیابی امن و امان کی ضامن اس لیے نہیں ہو سکے گی کہ پیشہ ور ڈاکو اور لٹیرے کبھی بھی اپنا اسلحہ واپس نہیں کریں گے اور حکومت کی کرپٹ مشینری میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ اصل مجرموں تک پہنچ سکیں۔ اس طرح غیر مسلح ہونے کے بعد عوام بالکل ہی ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائیں گے۔ بد امنی کے دوسرے ذرائع میں بھی جیسے بے روزگاری، غربت اور جنسی جرائم اور تشدد پر مبنی فلمی مناظر میں جو سینما، ویڈیو، کیبل نیٹ ورک، انٹرنیٹ اور ڈش پر دکھائے جاتے ہیں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن بھی ایسے مناظر دکھانے میں پیچھے نہیں ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے ساتھ نکاتی ایجنڈے کا پانچواں نکتہ ”ریاستی اداروں کو غیر سیاسی بنانا“ ہے۔ اس کے برعکس خود فوج کو ایک مکمل سیاسی ادارے میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور سیاسی ادارے کی تمام خرابیاں اس میں سرایت کرتی جا رہی ہیں۔ جنرل صاحب کے چیف آف آرمی اسٹاف ہوتے ہوئے صدر بن جانے سے فوج سیاسی دلدل میں مزید دھنس



گئی ہے اور اس سے فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے اور اس کی دفاعی صلاحیت سخت مجروح ہو رہی ہے۔ سرکاری ادارے صوبوں میں علیحدگی پسند عناصر کی قیادت کر رہے ہیں اور منفی سیاست کے مرکز بن گئے ہیں۔

حکومت کے ایجنڈے کا چھٹا نکتہ ”نچلی سطح پر اختیارات کی تقسیم“ ہے۔ اختیارات کی تقسیم کے نام پر جو بلدیاتی انتخاب کرائے جا رہے ہیں اس میں قومی تعمیر نو کے ادارے کے علاوہ کسی کا مشورہ شامل نہیں ہے۔ درحقیقت موجودہ حکومت کے ہاں مشورے کا کوئی نظام موجود نہیں ہے۔ اصل فیصلے کورکمانڈرز کے اجلاس میں ہوتے ہیں اور کورکمانڈر فوجی ڈسپلن کے پابند ہیں۔ وہ فوجی وردی میں ہوتے ہوئے اپنے چیف سے کیسے اختلاف کر سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ ڈسپلن کے آداب ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی نرمی اور ادب سے کسی مسئلے کا دوسرا پہلو پیش کر دیا جائے۔ اصل فیصلہ تو فرد واحد ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ فوجی حکومت اور اختیارات کی نچلی سطح تک تقسیم کا نکتہ باہم متضاد ہیں۔

فوجی حکومت کی سرشت میں اختیارات کے ارتکاز کا رویہ رچا بسا ہوتا ہے۔ اس سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ کوئی ایسا نظام رائج کرے گی جس میں حتمی اختیارات نچلی سطح تک منتقل ہو جائیں۔ نئے نظام کے نام سے درحقیقت یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ عوام کے لیے ایسا شکنجہ بنایا جائے جس میں انھیں مضبوطی سے جکڑا جاسکے۔ یہ کام بین الاقوامی مالیاتی ادارے، مخصوص ایجنڈے کی حامل این جی اوز اور ملٹی نیشنل کمپنیاں بلدیاتی اداروں کے ذریعے سرانجام دیں گی جن کی اصل منزل سیکولرازم، مغربی ثقافت کی ترویج اور عالمی مالیاتی اداروں کی حکمرانی کا قیام ہے۔ گرتی ہوئی قومی معیشت، غربت اور بے روزگاری اس طرح کا شکنجہ تعمیر کرنے میں مدد دیں گی۔ بہ حیثیت صدر جنرل پرویز مشرف اس شکنجے کی حفاظت پر مامور کر دیے گئے ہیں۔ ان کی موجودگی میں جو انتخابات ہوں گے اور جو پارلیمنٹ وجود

میں آئے گی اسے مجبور کر دیا جائے گا کہ وہ جنرل صاحب کے اقدامات کی توثیق کر دے۔ اس کے بغیر حکومت ان کی طرف منتقل نہیں کی جائے گی اور جنرل صاحب خود با اختیار صدر بن کر پارلیمانی طرز حکومت کو عملاً صدارتی طرز حکومت میں تبدیل کروانے کی کوشش کریں گے۔

بلدیاتی اداروں کو غیر جماعتی اس لیے بنایا گیا ہے کہ یہ ادارے براہ راست این جی اوز کے ذریعے عالمی اداروں کی تحویل میں آسکیں اور ترقیاتی کاموں کے نام سے ان سے اسلامی تہذیب و تمدن کو مٹانے اور عالم گیریت کے نام سے مغربی اور ہندو انہ تمدن کو عام کرنے کا کام لیا جاسکے۔

پرویز مشرف کے سات نکاتی ایجنڈے کا آخری نکتہ ”احتساب“ ہے۔ اسی کے نام پر انھوں نے فوجی مداخلت کی۔ احتساب اب سیاسی بلیک میلنگ کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اگر چند چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو زیر جال کیا بھی گیا ہے تو وہ نمائشی سے زیادہ نہیں۔ بڑی بڑی مچھلیاں تو نہ صرف گرفت سے باہر ہیں بلکہ عزت و اکرام کے ساتھ رہا کر دی گئی ہیں۔

اس وقت عوام موجودہ حکومت کی کارکردگی سے مایوس ہیں۔ رائے عامہ معلوم کرنے کے اداروں کے اعداد و شمار کے مطابق ملک کے تقریباً ۸۰ فیصد عوام ان تمام ایشوز پر جن کا احاطہ سات نکاتی ایجنڈے میں کیا گیا تھا، حکومت سے مایوس ہیں۔

پرویز مشرف صاحب سات نکاتی ایجنڈے میں ناکامی کے باوجود حکومت کرنے کا شوق رکھتے ہیں اور اپنا شوق پورا کرنے کے لیے انتہائی بھونڈے انداز میں صدر بن بیٹھے ہیں۔ آئینی لحاظ سے ان کے لیے صدر بننا ممکن نہیں تھا۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے کچھ نامور ماہرین قانون بلکہ قانون کے جادوگروں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں کہ وہ ان کے لیے انتخاب اور اسمبلیوں کو بحال کیے بغیر صدر بننے اور موجودہ صدر کو فارغ کرنے کی

کوئی سبیل نکال لیں۔ غالباً انھیں کوئی مہذب اور شائستہ راستہ دکھائی نہیں دیا اور انھیں یہی مشورہ دیا گیا کہ جس طرح فوج کے سربراہ کی حیثیت کو استعمال کر کے وہ بزورِ شمشیر چیف اگزیکیوٹو بن گئے تھے اور جس طرح اس حیثیت میں انھوں نے راتوں رات نواز شریف کو ملک بدر کر دیا تھا اور آئین اور قانون ان کے راستے میں حائل نہیں ہو سکا تھا اسی طرح شب خون مار کر وہ صدر تارڑ کو فارغ کر کے خود صدر بن جائیں۔ چیف آف آرمی اسٹاف کے صدر بننے سے فوج کو بھی نقصان ہوگا اور ملک کو بھی، لیکن پرویز مشرف صاحب کے لیے اب یہی ایک نکاتی ایجنڈا سب سے زیادہ اہم ہو گیا تھا کہ وہ کسی طرح ملک کے ایک بااختیار صدر بن جائیں۔ ان کا صدر بن جانا وفاقی پارلیمانی نظام کے بجائے صدارتی نظام رائج کرنے کی طرف ایک بڑا قدم ہوگا۔ یہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کی خلاف ورزی ہے جس کے تحت موجودہ حکومت کو مشروط طور پر تین سال کی مہلت دی گئی ہے۔

سپریم کورٹ کی ان شرائط میں پہلی شرط یہ ہے کہ دستور کی اسلامی دفعات اور ملک کی اسلامی نظریاتی اساس میں کسی قسم کا کوئی رد و بدل نہیں کیا جائے گا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ بنیادی حقوق اور عدلیہ کی آزادی میں کمی نہیں کی جائے گی۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وفاقی پارلیمانی نظام اور صوبوں کے اختیارات کو نہیں چھیڑا

جائے گا۔

ان شرائط کے ساتھ فوجی حکومت کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ تین سال مکمل ہونے سے قبل

انتخابات کا انعقاد کرائے تاکہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۲ء تک دستور بحال کر کے سویلین منتخب حکومت

بن سکے۔

جنرل پرویز مشرف صاحب کا صدر بن جانا اور یہ کوشش کہ فوج کو ترکی کی طرح ملکی

معاملات میں مستقل دستوری کردار دیا جائے اور نجلی سطح تک اختیارات کی تقسیم کے نام پر



قومی دستور میں بنیادی ترامیم کی جائیں، سپریم کورٹ کے مذکورہ فیصلے کی خلاف ورزی ہے جس کے ذریعے اس نے تین سال تک موجودہ حکومت کو مشروط طور پر جائز قرار دیا ہے۔

ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کو نظر انداز کرنے کی جو روش پرویز مشرف صاحب کی حکومت نے اپنائی ہے اس کی ایک تازہ مثال یکم جولائی سے ملک کے اندر سودی کاروبار کو غیر قانونی قرار دینے سے پہلو تہی ہے۔ سپریم کورٹ نے یکم جولائی ۲۰۰۱ء کو عملاً فیصلے کے نفاذ کے لیے حکومت کو پابند کیا تھا کہ وہ ایک ٹائم ٹیبل کے مطابق بتدریج مختلف قدم اٹھائے تاکہ ۳۰ جون کے بعد سود کے خلاف قانون ہو جانے کے بعد کوئی عملی مشکل یا بحران پیدا نہ ہو سکے لیکن حکومت نے جان بوجھ کر مطلوبہ اقدامات کرنے سے احتراز کیا تاکہ عین موقع پر اسی بہانے فیصلے کو موخر کروا سکے کہ اس کا نفاذ فوری طور پر ممکن نہیں ہے۔ یہ روش قومی مصلحت کے خلاف ہے؟ دراصل حکمران معیشت کو سود سے پاک کرنے میں مخلص نہیں ہیں۔

معاشی پالیسی بنانے والوں کا مفاد موجودہ سودی معیشت سے وابستہ ہے۔ عالمی اداروں کے یہی آلہ کار قومی معیشت کو ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور بین الاقوامی معاشی اداروں کے چنگل سے آزاد کرنے کے راستے میں حائل ہیں۔ اس لیے موجودہ حکومت نے بھی یونائیٹڈ بینک کو ذریعہ بنا کر سپریم کورٹ کے فیصلے پر نظر ثانی کی اپیل دائر کر رکھی ہے۔ فی الحال حکومت سپریم کورٹ کی اپلیٹ بنچ سے اپنی مرضی کا فیصلہ اس لیے نہیں لے سکی کہ بنچ مکمل نہیں تھا۔ اس پر جماعت اسلامی کے وکیل نے اعتراض اٹھایا کہ بنچ نامکمل ہے اور کیس سننے کے قابل نہیں ہے۔ اس نکتے کو فاضل ججوں نے تسلیم کیا لیکن حکومت نے دباؤ کے حربے استعمال کر کے ایک عالم دین کی جگہ خالی رکھتے ہوئے اس عدالتی سقم کے باوجود ایک سال کی مہلت حاصل کر لی جو عدالت کی کمزوری اور حکومت کی بدنیتی کا کھلا کھلا ثبوت ہے۔ عدالتوں کی بالادستی کے بغیر کسی بھی ملک میں ایک مہذب، شائستہ اور جمہوری معاشرہ

قائم نہیں ہو سکتا۔ سب سے بڑا سوال اس وقت یہی ہے کہ وہ کون سی طاقت ہے جو ملک میں دستور، قانون اور قاعدے ضابطے کو نافذ کر کے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) دو دو مرتبہ حکومت میں آنے کے باوجود اپنی ناکامی ثابت کر چکے ہیں۔ اس وقت الائنس فار ریٹوریشن آف ڈیموکریسی (ARD) کی شکل میں یہ دونوں جماعتیں اکٹھی ہیں۔ اگر فوجی حکومت کی ناکامی ثابت ہونے کے بعد حکومت واپس ان جماعتوں کے پاس چلی جائے تو کیا انصاف کے تقاضے پورے ہو جائیں گے۔ خود ان دو جماعتوں کا سب سے بڑا حامی بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا، نہ عوام اس کو تسلیم کریں گے۔ اگر پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور فوجی حکومت مسئلے کا حل پیش نہ کر سکیں تو کیا ملک میں کوئی اور طاقت نہیں ہے۔ کیا ہماری قوم کے مستقبل میں بالکل اندھیرا اور مایوسی ہے!

یقیناً ملک کے اندرونی اور بیرونی دشمن یہی تصور پیش کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ”ناکام ریاست“ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ریاست ناکام ہے یا وہ سیکولر حکمران گروہ ناکام ہو چکا ہے جو ملک کی تشکیل سے لے کر اب تک مختلف سیاسی اور فوجی لبادوں میں ملک پر مسلط ہے اور جسے سابق استعماری طاقت نے پاکستان پر حکومت کرنے کے لیے تیار کیا تھا؟ آزادی کے بعد کے ساڑھے پانچ عشروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ ناقابل تردید حقیقت سامنے آتی ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح کے انتقال اور قائد ملت لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد سے ملک میں اسی ایک طبقے کا اقتدار رہا ہے۔ یہ طبقہ ایک آزاد قوم کی اُمنگوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر سکتا اور اپنے اخلاق و کردار کے حوالے سے بلند ہونے کے بجائے مسلسل زوال و انحطاط کی طرف جاتا رہا، یہاں تک کہ اب اس میں سکت نہیں کہ اندر سے اپنی اصلاح کر سکے۔ اب اس کی اصلاح کے لیے ایک انقلابی طاقت کی ضرورت ہے اور وہ انقلابی طاقت، عوامی قوت کو منظم اور متحرک کرنے سے ہی وجود میں آ سکتی ہے۔ یہی وہ

طریقہ ہے جس سے ایک تازہ دم دیا ننداز با حوصلہ قیادت اُبھر سکتی ہے جو عوام میں سے ہو اور خدا اور خلق دونوں کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھتی ہو۔

پاکستانی قوم کی بہت بڑی اکثریت اس وقت ملک کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہے۔ یہ فکر مندی ان کے حب وطن کی ایک مثبت علامت ہے۔

اس فکر مندی کو مایوسی کی طرف لے جانے کے بجائے قوتِ عمل میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو محض خود پر امید ہی نہ ہو بلکہ ذوقِ یقین سے سرشار ہو۔ مولانا رومؒ کے ان اشعار کو علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب اسرارِ خودی کے سرنامے کے طور پر کتاب کے پہلے صفحے پر درج کیا ہے:

دی شیخ با چراغِ ہمی گشت گردِ شہر  
کز دام و ددِ ملولم و انسا نم آرزوست  
زیں ہمرہانِ ست عناصرِ دلم گرفت  
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست  
گفتم کہ یافت می نشود جتہ ایم ما  
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

”ایک بزرگ چراغ لے کر شہر کی گلی کو چوں میں پھر رہے تھے کہ جعل سازوں اور فریب کاروں سے آزرده ہوں اور ایک حقیقی انسان کی تلاش میں گردش کر رہا ہوں۔ ان در ماندہ ست رفتار ہم را ہیوں سے بھی میرا دل اُچاٹ ہو گیا ہے، کسی شیرِ خدا اور کسی رستم کی آرزو میں نکل کھڑا ہوں۔ میں نے عرض کی کہ ہم نے بہتیرا تلاش کیا ہے اس طرح کے لوگ نایاب ہیں۔ اس نے کہا جو نایاب ہیں انھی کی آرزو میں پھر رہا ہوں۔“

اس وقت ہمیں اس طرح کی قیادت کی ضرورت ہے جو قوم کی آرزوؤں کو تازہ رکھے



کہ مرگ آرزو ہی اصل میں قوموں کی موت کا سبب بنتی ہے۔ اقبال نے اس لیے اپنی کتاب ’زبورِ عجم پڑھنے والوں کو نصیحت کی ہے:

می شود پردہ چشم پرکا ہے گا ہے  
دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگا ہے گا ہے  
وادی عشق بے دُور و دراز است و لے  
طے شود جادہ صد سالہ بہ آہے گا ہے  
در طلب کوش و مدہ دامن اُمید زدست  
دولتے ہست کہ یابی سر را ہے گا ہے

”کبھی تو ایک معمولی تنکا میری آنکھ کے لیے پردہ بن جاتا ہے اور کبھی میں ایک نگاہ سے دونوں جہان دیکھ لیتا ہوں۔ تلاش و جستجو میں سرگرم رہو اور اُمید کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑو۔ ایسی بھی دولت ہے جو تمہیں کبھی سر راہ بھی مل جاتی ہے۔ عشق کی وادی اگرچہ بڑی وسیع اور دُور دراز ہے لیکن کبھی کبھی سو سالہ راستہ ایک آہ میں بھی طے ہو جاتا ہے۔“

اپنی کتاب ”پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق“ کی ابتدا میں کتاب پڑھنے والوں کو یہ

پیغام دیتے ہیں:

سپاہ تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق  
کہ در حرمِ خطرے از بغاوتِ خرد است  
زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ او را  
جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است  
بآں مقام رسیدم چو در برش کردم  
طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزان نیست

نگاہ بندہٴ مومن قیامتِ خرد است

”عشق کی ولایت سے تازہ افواج کی بھرتی ضروری ہو گئی ہے کہ عقل کی بغاوت سے حرم میں خطرہ نمودار ہو گیا ہے۔ زمانہ اس کی حقیقت سے کلی طور پر بے خبر ہے۔ جنون ایسی قبا ہے کہ عقل کی قامت پر بالکل ہی موزوں اور پوری ہے۔ میں عشق کے اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ جب میں نے اس کا دروازہ کھولا تو مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ میرے بام و در کا طواف کرنا عقل کی سعادت ہے۔ یہ گمان نہ کر کہ خرد کے لیے حساب و میزان نہیں۔ مرد مومن کی نگاہ خرد کی قیامت ہے“ (یعنی اس سے خرد کی تگ و تاز کی قیمت جانچی جاسکتی ہے)۔

عشق اور خرد یا جنون اور عشق کا موازنہ اقبالؒ کے پیغام کا ایک اہم موضوع ہے۔ جب عقل و خرد کے حساب کتاب سے قوم کو ولولہ تازہ دینے میں انھیں مشکل پیش آتی ہے تو وہ بندہٴ مومن کی ایمانی طاقت اس کے عشق اور اس کے جذبہٴ جنون کو ابھارتے ہیں۔ ایک خوبصورت رباعی میں فرماتے ہیں:

الا یا خیمگی خیمہ فروہل

کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل

خرد از راندن محمل فروماند

زمامِ خویش دادم در کفِ دل

”خبردار ہو جاؤ، خیمے میں بیٹھنے والوں کو چھوڑ دے کہ قافلے کا پیش رو (قافلے سے آگے چلنے والا پیش آہنگ) اپنے مقام سے نکل کھڑا ہوا ہے۔ عقل بوجھ اٹھانے سے عاجز آگئی ہے۔ اس لیے اب میں نے اپنی مہار دل کے ہاتھ میں تھادی ہے۔“

ہم بھی قومی لحاظ سے اس وقت ایک ایسی کیفیت میں مبتلا ہیں کہ قوم کے ایک بڑے

حصے میں پائی جانے والی ایمانی طاقت کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

اگر کسی کو اس ایمانی طاقت کی موجودگی میں شک ہے تو وہ ان ہزاروں نوجوانوں سے ملاقات کا اہتمام کر لیں جنہیں موت کی وادی سے اس پار محبوب کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ یہ نوجوان ہزاروں میل دشوار گزار راستوں کو عبور کرتے ہیں، بھارتی درندوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے اپنی ماؤں اور بہنوں کی عصمتیں بچانے اور اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ اپنے آپ کو شہادت کے لیے پیش کرنے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ یہ نوجوان اُمت کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ فلسطین، کشمیر، شیشان، جنوبی لبنان، فلپائن، ان کی فداکارانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ ہیں۔ یہ نوجوان خود ہماری پاکستانی قوم کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ رنگ و نسل اور زبان کے تفرقے سے بالاتر ہیں۔ یہی وہ نوجوان ہیں جو ستاروں پر کمند ڈالتے ہیں اور جو قوموں کی ڈوبتی کشتیوں کو طوفانوں سے نکال کر ساحلِ مراد تک پہنچاتے ہیں۔

ہماری قوم کی اس ناقابل شکست قوت کے خلاف گہری سازش ہو رہی ہے۔ اسے آپس میں لڑانے کے لیے بیرونی اور اندرونی دشمن مدت سے سرگرم عمل ہیں۔ شیعہ سنی کے درمیان قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن یہ لڑائی دو چھوٹے اور مختصر گروہوں تک محدود رہی اور عوام الناس نے اس میں شامل ہونے سے گریز کیا۔ اب بریلوی دیوبندی خوں ریزی پھیلانے کی سازش کی جا رہی ہے۔ ایک دوسرے کی مساجد پر قبضے کا سلسلہ تو بہت عرصے سے چلا آ رہا ہے۔ اب مولانا محمد سلیم قادری اور ان کے اہل خانہ اور ساتھیوں کے قتل سے کشیدگی ایک تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ہے۔ کراچی میں ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر قتل اور دہشت گردی کے واقعات کا رونما ہونا خطرے کی گھنٹی ہے۔ اگر دینی جماعتوں کے نوجوان مجاہدین کو جو میدانِ جہاد میں دشمن کے چھکے چھڑانے کی



صلاحیت رکھتے ہیں، اس تباہ کن اور بے فیض تصادم میں الجھا دیا گیا تو یہ پوری قوم کی بدبختی ہوگی۔

ملک و قوم کو اس روزِ بد سے بچانے کے لیے دینی قائدین کے درمیان گہرے ذاتی روابط کی ضرورت ہے۔ ذاتی روابط سے بدگمانیاں دور ہو جاتی ہیں اور آپس میں حسنِ ظن کو فروغ ملتا ہے اور بہت سارے اختلافات جو بدگمانی کی پیداوار ہوتے ہیں محض آپس کے گہرے رابطے اور ایک دوسرے کے بارے میں حسنِ ظن رکھنے سے رفع ہو جاتے ہیں۔ دینی جماعتوں کے کارکنوں اور ہر سطح کی قیادت کا بھی فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ روابط پیدا کرنے کے لیے پیش رفت کریں۔ اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کو پہل کرنی چاہیے اور ہر سطح پر خوشگوار فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ الحمد للہ جماعت کے کارکن پہلے ہی ہر طرح کے لسانی اور فرقہ وارانہ عصبیت سے پاک ہیں، لیکن آج کل کے حالات میں نہ صرف انھیں خود زیادہ محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے بلکہ دینی گروہوں اور مسلکوں کے درمیان بھی ثالث بالخیر کا کردار ادا کرنے کے لیے سرگرم عمل ہونا چاہیے۔

یہاں اس حقیقت کا ادراک بھی ضروری ہے کہ دینی قوتوں کو باہم لڑانے کی حکمتِ عملی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یورپ کی تاریخ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں اور ان دونوں فرقوں کے اندر دوسرے چھوٹے چھوٹے فرقوں (Denominations) کے درمیان نہ ختم ہونے والی جنگ و جدال ہی کے ذریعے سیکولر قوتوں نے اپنا سیاسی مقام پیدا کیا اور بالآخر مذہب کو ریاست کی صورت گری کے کام سے بے دخل کر دیا گیا۔ انیسویں صدی میں انگریز سامراجی حکمرانوں نے ہندو مہاسبھا کے احیا اور شدھی کی تحریک کی پشت پناہی اور مسلمانوں میں فرقہ واریت کے فروغ کی شکل میں بھی کھیل کھیلا لیکن تحریکِ خلافت

تحریک پاکستان اور تحریک اسلامی نے مسلمانوں کے اندرونی اختلاف کو دور کیا اور باہم رواداری اور مشترک اعلیٰ مقاصد کے لیے اتحاد و یکجہتی کی شاہراہ دکھائی۔ آج پھر دشمن وہی کھیل کھیل رہا ہے۔ آج پھر دینی قوتوں کا فرض ہے کہ اس کھیل کو نا کام بنادیں اور دین کے احیا اور شریعت کی بالادستی کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

جماعت اسلامی اس ملک کی ایک موثر اور منظم دینی سیاسی قوت ہے۔ جب اس کے کارکن پورے اخلاص سے کسی بڑے کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں تو وہ اللہ کے فضل سے چل پڑتا ہے۔ اس وقت قوم کو مایوسی سے نکال کر عمل پر آمادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کتاب جہاد ہے اور بے غرض اور مخلصانہ جدوجہد کی تلقین کرتا ہے۔ مایوسی سے بچانے کے لیے قرآنی حکم ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (ال عمران ۱۳۹)  
 ”دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔“

أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۝  
 (حم السجدہ ۴۱: ۳۰)

”نہ ڈرو نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنگ کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔“

قوم اس وقت ایک ایسے گروہ کے انتظار میں ہے جو میدان میں نکل کر ان کی قیادت کرے۔ گھروں اور دفاتروں میں بیٹھ کر یہ توقع رکھنا درست نہیں ہے کہ قوم ہماری طرف خود بخود آجائے گی۔ اس کے لیے ہمیں ہر دروازے پر دستک دینی ہے۔ ہر صاحب ایمان کو پکارنا اور ہر محب وطن کو بیدار اور متحرک کرنا ہے۔ دلوں کو جوڑنا اور سب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ملک و قوم کو اس عذاب سے نجات دلانا ہے جس میں سیکولر اشرافیہ (elites) نے

اپنے بیرونی استعمار کے مفادات کی خاطر اسے جھونک دیا ہے۔

پہلے قائدین قربانی دینے کے لیے تیار ہوں گے، اندھیروں میں چراغ روشن کریں گے، پھر کارکن نکلیں گے۔ اس کے بعد قوم نکل کر ساتھ دے گی۔ جو لوگ صرف ظن و تخمین کے گھوڑے دوڑا کر اندازے لگاتے ہیں ان کے اندازے ہمیشہ انقلابی قوتوں کے مقابلے میں شکست کھا جاتے ہیں۔ جب اللہ کے بھروسے پر اپنا فرض ادا کرنے کے لیے مردانِ حرمیدان میں نکلتے ہیں تو وہ اللہ کی تقدیر بن جاتے ہیں۔ اس وقت پاکستان کو دشمنوں کی یلغار سے بچانے کے لیے ان ہی مردانِ حُر کی ضرورت ہے لیکن قومی بیداری کے اس کام میں ہر طبقے کے مخلص لوگوں کو ساتھ لینے کی ضرورت ہے۔ ہماری فوج ہم میں سے ہے۔ قوم کو اپنی فوج سے تصادم مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قوم کے تمام طبقات کے بہتر لوگوں کی طرح فوج کے اندر صاحبِ ایمان و تقویٰ عناصر اور جہاد فی سبیل اللہ کو اپنا طریق زندگی بنانے والے عناصر کی کمی نہیں ہے۔ ملک و قوم جس دلدل میں پھنسی ہوئی ہے وہ لوگ اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ اگر قوم کی مخلص قیادت مل جل کر قومی نجات کے لیے حکمت و دانش کے ساتھ لیکن مومنانہ بصیرت اور جرأت کے ساتھ میدانِ عمل میں اُتر جائے گی تو یہ تمام عناصر ان کا خیر مقدم کریں گے کہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔

(جولائی ۲۰۰۱ء)



## دورہ امریکہ — مقاصد افادیت اور خدشات

اس وقت مغربی ممالک خصوصاً شمالی امریکہ (ریاست ہائے متحدہ اور کینیڈا) برطانیہ، جرمنی اور فرانس میں الحمد للہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد اکٹھی ہو گئی ہے۔ امریکہ اور مغربی یورپ کے ممالک میں مقامی باشندے بھی اسلام قبول کر رہے ہیں۔ یہ لوگ منظم بھی ہو رہے ہیں۔ انھوں نے یورپ اور امریکہ کے کونے کونے میں مساجد اور اسلامی مراکز قائم کر رکھے ہیں اور اس وجہ سے عرب و عجم کی تمام دینی جماعتوں کے ان تنظیموں سے رابطے موجود ہیں اور ان جماعتوں کے زعماء و قفا و قفان ممالک کے دورے بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کم و بیش ایک کروڑ کی تعداد میں مسلمان موجود ہیں۔ یہ تعداد امریکہ کی کل آبادی کا دو سے لے کر تین فیصد ہے۔ اس طرح عیسائیت کے بعد اسلام امریکہ کا سب سے بڑا مذہب بن چکا ہے۔ جرمنی اور برطانیہ میں ۵ فیصد اور فرانس میں کل آبادی کے تقریباً ۱۰ فیصد مسلمان ہیں۔

اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود موثر قیادت کی عدم موجودگی اور منصوبہ بندی کے فقدان کی وجہ سے وہاں کے ماحول اور معاشرے پر اسلام اور مسلمانوں کے کما حقہ اثرات مرتب نہیں ہو سکے ہیں۔ تاہم مادی طاقت کے لحاظ سے دنیا کے اہم ترین ممالک کے شہری ہونے کی حیثیت سے، مغربی ممالک کی اس مسلم اقلیت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس مسلمان اقلیت کے ساتھ رابطہ رکھنا، انہیں دین کے بنیادی تقاضوں کی طرف

متوجہ کرنا اور اسلام کے سفر کی حیثیت سے مغربی معاشرے میں انھیں اپنے فرائض سے آگاہ کرنا ایک اہم دینی فریضہ ہے۔ ان ممالک کے سمجھدار اور ممتاز مسلمان شہری اس ضرورت سے پوری طرح آگاہ ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ عالم اسلام کے ممتاز رہنما ان ممالک کے دورے کریں اور ان کی کشش سے وہ مقامی مسلمانوں کو مدعو کریں اور انھیں ان ممالک کے اندر سیاسی، معاشی اور معاشرتی اثر و رسوخ پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس دلائیں۔ اب خود مغربی دانشور اور مغرب کی حکومتیں یہ محسوس کرنے لگی ہیں کہ ”اسلام اور مغرب“ (Islam and the West) کے موضوع کے ساتھ ساتھ اس وقت ”مغربی ممالک میں اسلام“ (Islam in the West) ایک اہم ترین موضوع بن گیا ہے۔ مغربی معاشرے کو یہ یقین دلانا کہ اسلام انسانیت کی بھلائی اور خیر و فلاح کا دین ہے، امت مسلمہ کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے، یہ دین قوم پرستی کا نہیں خدا پرستی کا دین ہے اور کسی خاص رنگ و نسل اور علاقے کے بجائے انسانیت کی بھلائی چاہتا ہے اور خود مغربی معاشرے کے لیے اس کے پاس خیر و برکت کا پیغام ہے، وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اسلام دشمن طاقتوں خاص طور پر صیہونی لابی کی طرف سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ اسلام کو دہشت گردی، خون خرابے، تخریب کاری، تشدد، انتہا پسندی اور قتل و غارتگری کا مذہب قرار دے کر اس رجوع عام کا راستہ روکا جاسکے جو اسلام کے طبعی حسن اور اس کے دین فطرت ہونے کے حوالے سے اس وقت مغربی معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ کچھ دانشوروں نے تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ (Clash of civilization) وسیع پیمانے پر مشہور کر دیا جس کے ذریعے سے اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں تصادم کو ناگزیر قرار دے دیا گیا اور اس طرح اسلام اور اسلامی تہذیب کو دشمن ٹھہرا کر عام لوگوں کے ذہن کے درپچوں پر تعصبات اور شکوک و شبہات کے پردے ڈال دیے گئے تاکہ اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے

راستے مسدود ہو جائیں۔ مخالفین کی اڑائی ہوئی اس گردوغبار کو دور کرنے اور شکوک و شبہات کا ازالہ کرنے اور اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے تصادم کے نظریے کے بجائے گفت و شنید اور افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کرنے کے لیے مغربی پالیسی اداروں اور ان کے دانشوروں تک اپنا موقف پہنچانے کی بھرپور کوششوں کی ضرورت ہے۔

بعض معترضین کو امریکی حکومت کی پالیسیوں سے شدید اختلاف رکھنے کی بنا پر میرے دورہ امریکہ پر حیرت ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے پالیسی میں تبدیلی کی علامت ٹھہرایا ہے اور کچھ لوگوں نے اسے جماعت اسلامی کی قیادت پر اعتراضات کا سنہری موقع سمجھ کر بے جا الزام تراشی شروع کر دی ہے لیکن یہ بات اہل علم و دانش سے پوشیدہ نہیں ہے کہ باہم اختلافات رکھنے والے گروہوں کی قیادتوں میں رابطہ اور مذاکرات اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ عین میدان جنگ کے اندر بھی لڑنے والے گروہوں کے درمیان رابطہ موجود رہتا ہے اور رابطہ بھی کشمکش کے میدان ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

میرا دورہ امریکہ بھی بنیادی طور پر اسی نوعیت کا دورہ تھا۔ میں پچھلے سال بھی حلقہ اسلامی شمالی امریکہ کی دعوت پر امریکہ گیا تھا اور ان کے سالانہ کنونشن میں شرکت کے علاوہ مختلف شہروں میں ان کے زیر اہتمام مساجد اور اسلامی مراکز میں اجتماعات میں شرکت کی تھی۔ اس سال بھی ان کے کنونشن میں شرکت کے بعد میں نے مسلمانوں کے مختلف اجتماعات میں شرکت کے لیے امریکہ اور کینیڈا کا دورہ کیا۔

اس دفعہ اس دورے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ پاکستان میں امریکہ اور کینیڈا کے سفارتخانوں کے ساتھ یہ طے ہوا کہ ان میں ان ممالک میں دانشوروں اور وزارت خارجہ کے ذمہ داران سے بھی ملاقات کروں۔ ان ملاقاتوں کا اہتمام اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ لوگ اسلامی تحریکوں کے موقف کو اس کی قیادت کے ایک اہم آدمی سے براہ راست سننا چاہتے



۱۵۹ ————— مضامین قاضی حسین احمد

تھے اور میں انہیں اسلام اور مسلمانوں کا عادلانہ موقف سنانا چاہتا تھا۔  
اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مجھے موقع ملا کہ میں مسلمانوں کے اہم مسائل پر مضبوط دلائل  
کہہ سکتا ہوں اور ان کے عادلانہ موقف پر امریکی یا یسوسی ساز اداروں کے اہم افراد کے

کر رکھا ہے۔ یوں کشمیر کے لوگ اس آزادی سے اب تک محروم ہیں جو اگست ۱۹۴۷ء میں پورے برعظیم کو مل گئی تھی۔ بارہا وعدوں کے باوجود بھارت اب تک اقوام متحدہ کی قراردادوں عمل درآمد میں ناکام رہا ہے اور اس نے مسلسل یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ کشمیر اس کا الٹو انگ ہے۔ حالانکہ خود بھارت اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے گیا تھا اور اس نے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جب تک بھارت اپنی اس لالی یعنی رٹ کو نہیں چھوڑے گا اور کھل کر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرے گا کہ کشمیر اس کا الٹو انگ نہیں بلکہ متنازعہ علاقہ ہے اس وقت تک کسی بھی فارمولے پر بات کرنا بے نتیجہ ہے۔

میری موجودگی میں کسی بھی میننگ میں کوئی اور تجویز اس لیے سامنے نہیں آ سکی کہ میرا یہ موقف بالکل واضح تھا کہ جب تک بھارت کشمیر کی متنازعہ حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا، کسی بھی اور تجویز پر کوئی بامعنی بات کرنا ممکن نہیں ہے۔ ۲۴ جولائی کو جب میں اپنا دورہ مکمل کر کے وطن واپسی کی تیاری کر رہا تھا مجھے بی بی سی والوں نے فون پر بتایا کہ عبدالجید ڈار صاحب نے سری نگر میں یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کیا ہے، میں اس پر اپنا رد عمل دوں۔ میرے لیے یہ اطلاع ناقابل یقین تھی اس لیے میں نے فوری تبصرے سے گریز کیا لیکن مرکز جماعت سے فون کے ذریعے جب جنگ بندی کے اعلان کی تصدیق ہوئی تو میں نے نیویارک ہی میں اس سے مکمل برات کا اعلان کیا اور اسے ناپختہ ذہن کی کارروائی قرار دیا۔

جماعت کے بعض ناقدین نے اس اعلان کو میرے دورہ واشنگٹن کے ساتھ جوڑنے کی افسوسناک کوشش کی لیکن الحمد للہ جماعت کے واضح موقف کی وجہ سے انھیں جماعت کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے میں کامیابی نہ ہو سکی اور اس سلسلے میں پیدا کیا جانے والا سارا ابہام اب تک دور ہو چکا ہے۔ حزب المجاہدین پوری یکسوئی کے ساتھ دوبارہ جماعت اسلامی کے موقف کی تائید کر رہی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے بھارت کو

ہٹ دھرمی سے باز آنے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مسئلہ کشمیر کے حل کرنے کے لیے بامقصد سہ فریقی مذاکرات (پاکستان، بھارت اور کشمیری عوام) منعقد کرنے کے موقف پر ثابت قدمی سے قائم ہے۔

فلسطین کا مسئلہ اس وقت انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ واشنگٹن میں میری موجودگی کے دوران ہی میں صدر کلنٹن اسرائیلی وزیراعظم ایہود باراک اور فلسطینی رہنمایا سر عرفات کے درمیان مذاکرات کرانے میں مشغول تھے۔ امریکہ اور کلنٹن کی پوری کوشش یہی ہے کہ یا سر عرفات پر دباؤ ڈال کر اسے اس موقف سے دستبردار کر دے جس کی تائید اقوام متحدہ کی پوری جنرل اسمبلی کر چکی ہے، یعنی ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مقبوضہ علاقوں بشمول مشرقی یروشلم سے اسرائیل نکل جائے اور فلسطینیوں کو جو ۵۰ سال پہلے اپنے آباؤ اجداد کے گھروں سے نکالے گئے تھے واپس اپنے گھروں اور علاقوں میں بسنے کا حق دیا جائے۔

امریکہ کا دوہرا معیار فلسطین میں کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ اپنے مقاصد اور مفادات کے حصول کے لیے تو وہ اقوام متحدہ کو ذریعہ بناتا ہے لیکن اسرائیل کے مفادات کی خاطر اور فلسطینیوں کے حقوق کا خون کرنے کے لیے اسے اقوام متحدہ کی واضح قراردادوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ حالانکہ اقوام متحدہ نے بھی فلسطینیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسرائیل کی ناجائز ریاست کی تشکیل میں اقوام متحدہ نے پورا پورا ساتھ دیا ہے لیکن خود اس ادارے نے جہاں اسرائیل کو کوئی معمولی سی تلقین بھی کی ہے اسرائیل اسے بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور امریکہ پوری عالمی رائے عامہ کے برخلاف پوری ڈھٹائی کے ساتھ اکیلا اسرائیل کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ یا سر عرفات پر مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے کہ فلسطینی اپنے مسلمہ حقوق سے دستبردار ہو جائیں۔ ہم نے ہر فورم پر امریکہ کے اس ظالمانہ رویے کی مذمت کی ہے۔



اس وقت پاکستان پر امریکہ کی طرف سے دہشت گردی کے حوالے سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے حالانکہ دہشت گردی کا ہدف خود پاکستان ہے۔ بھارت کے ذمہ دار افراد بر ملا اس کا اعتراف کرتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر کشمیر میں جہاد جاری رہے گا تو پاکستان میں بھی دھماکے جاری رہیں گے۔ حالانکہ کشمیر کی جدوجہد آزادی بین الاقوامی قانون کے تحت آزادی کی ایک مسلمہ جدوجہد ہے جس کی اخلاقی تائید کرنا اقوام عالم کا فرض ہے۔ جب تک اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت بھارت کو کشمیریوں کا حق خود ارادیت دینے پر مجبور نہ کیا جائے اس وقت تک کشمیریوں کے لیے مسلح جہاد ہی واحد راستہ باقی رہ گیا ہے لیکن پاکستان میں دہشت گردی بلا جواز ہے۔ یہ چوری چھپے ہو رہی ہے۔ معصوم اور بے گناہ لوگ اس کا شکار ہو رہے ہیں اور اس کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز نہیں ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ دہشت گردی کو ختم کرنے کا ذریعہ ہے۔ جہاد میں کسی معصوم کے خلاف کارروائی کرنے، اسے گزند پہنچانے یا اسے یرغمال بنانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن معصوم پاکستانیوں کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیاں روکنے کے لیے بھارت پر دباؤ ڈالنے کے بجائے پاکستان کے خلاف اس کے ساتھ امریکہ کا گٹھ جوڑ اور پاکستان کو خطے میں الگ تھلگ کرنے کی کوشش یہاں تک کہ چین، وسط ایشیا اور روس کو بھی پاکستان اور افغانستان کے خلاف اُکسانا ایک کھلی دھاندلی ہے۔ اس حوالے سے میں نے امریکی پالیسی ساز اداروں کے سامنے کہا کہ پاکستان امریکہ کا ایسا حلیف ہے جو امریکی غتاب کا سب سے زیادہ ہدف (Most sanctioned ally) ہے۔

ان مسائل کے علاوہ میں نے اسلام اور مغربی دنیا کی تمدنی اور تہذیبی کشمکش میں اسلام کا موقف پیش کرنے کے لیے پانچ اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا:

۱۔ انسان تمام معاملات میں درست رویہ اختیار کرنے کے لیے ہدایت ربانی

۱۶۳ ————— مضامین قاضی حسین احمد

(Divine guidance) کا محتاج ہے۔ خالق کائنات کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خالص مادہ پرستانہ طرز فکر کے نتیجے میں انسان ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار ہوا ہے اور ٹکنالوجی میں ترقی کے باوجود اس وقت عالم مغرب جس اضطراب اور بے چینی کا شکار ہے وہ اسی مادہ پرستانہ رویے کا نتیجہ ہے۔ مغرب میں اگرچہ چند اہل فکر و دانش اب اجتماعی اور انفرادی زندگی میں مذہبی اعتقادات کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہو گئے ہیں لیکن عمومی سوچ اب بھی سیکولرزم پر مبنی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مغرب میں ۴۰۰ سال تک مذہبی توہم پرستی اور عقلیت کی کشمکش کے بعد عقلیت نے اوہام پرستی پر غلبہ پالیا ہے۔ ان کے خیال میں اسلامی دنیا اور مسلمان اس کشمکش سے اب گزر رہے ہیں جس سے یہود و نصاریٰ نکل آئے ہیں اور جدید سائنسی ترقی اور ٹکنالوجی کا عروج ان کی اسی آزادی کا نتیجہ ہے جو انھوں نے مذہبی اوہام پرستی سے حاصل کر لی ہے۔ اس وقت مغربی معاشرے میں جو اخلاقی زوال آ رہا ہے اور جس طرح سے ان کی خاندانی زندگی افراتفری اور انتشار کا شکار ہے اس سے وہاں کے بعض صاحب دانش پریشان ہیں۔ بلاشبہ مغرب میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اسلام کی آواز کو اپنے تاریخی پس منظر سے ہٹ کر دیکھنے پر آمادہ ہیں اور اسلام اور اسلامی تحریک کی خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن مغرب کی عمومی روش اب بھی سیکولرزم اور مادہ پرستی ہی کی ہے۔ اس وقت مغرب کو پوری قوت، لیکن حکمت اور دانائی سے یہ سات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہدایت ربانی کے بغیر انسان کبھی سکون و اطمینان حاصل نہیں کر سکتا۔

آزادی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے لیکن فرد کی آزادی اجتماع کے لیے سوہان روح

نہیں بنی چاہیے۔ نہ ہی ایک گروہ کی آزادی دوسرے گروہ کے لیے اشتعال انگیز یا دل آزاری کا سبب بنی چاہیے۔ بنیادی حقوق کے تصور میں اعتدال ہونا چاہیے اور پوری دنیا پر مغربی اقدار اور تہذیب کی چھاپ لگانے اور دوسروں کے مذہبی اور دینی اعتقادات کے خلاف اقدامات سے مغربی دنیا کو گریز کرنا چاہیے۔

۳- مرد و زن اگرچہ حقوق میں برابر ہیں لیکن ذمہ داریوں میں اور صلاحیتوں میں برابر نہیں ہیں۔ دونوں کی صلاحیتوں اور ذمہ داریوں میں فرق ہے۔ بعض حیثیتوں سے خواتین کی ذمہ داریاں انسانیت کی خیر و فلاح کے لیے زیادہ اہم ہیں لیکن بعض ذمہ داریوں کی صلاحیت صرف مردوں میں موجود ہے۔ عورت پر اس کی جسمانی اور نفسیاتی صلاحیتوں کے علی الرغم مردوں کا بوجھ ڈالنا اس کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ برابری کا حکم دے کر عورت کو فریب دیا جا رہا ہے جس سے اس کی ذمہ داریوں اور مصائب میں اضافہ ہوا ہے۔ مرد و زن کا امتیاز ختم کرنے کی اس غیر فطری کوشش کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مغربی دنیا میں خاندانی زندگی برباد ہو گئی ہے۔

۴- عالمی سطح پر وسائل کی تقسیم غیر منصفانہ ہے۔ روئے زمین کے ۸۷ فیصد وسائل ۲۰ فیصد لوگوں کے تصرف میں جبکہ ۸۰ فیصد لوگوں کے پاس صرف ۱۳ فیصد وسائل ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وسائل کے بہاؤ کا رخ اس وقت بھی غریب ممالک سے امیر ممالک کی طرف ہے۔ اس غیر منصفانہ تقسیم کا علاج کرنا عالمی امن کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

۵- بڑے پیمانے پر انسانیت ہلاکت کے نیوکلیئر، کیمیائی اور حیاتیاتی (Biological)



ہتھیار اصلاً غیر انسانی اور غیر اسلامی ہیں۔ اسلام کے قانون جنگ کے مطابق جنگ کے دوران بھی کسی غیر محارب (non-combatant) کو گزند پہنچانا ممنوع ہے لیکن مغربی ممالک نے طرح طرح کے ہلاکت خیز ہتھیار ایجاد کر کے انسانیت کی تباہی کا سامان کر لیا ہے۔ اگر ہم ان ہتھیاروں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دفاع کا انتظام نہیں کریں گے تو ہمارا حشر بھی ہیر و شیمہ اور ناگاساکی کی طرح ہوگا۔ کیونکہ بقول شاعر مشرق ع

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

۶- ہمارا نیوکلیر پروگرام دفاعی ہے جارحانہ نہیں ہے۔ اگر امریکہ، روس اور دوسری اقوام بشمول بھارت اور اسرائیل تمام ہلاکت خیز ہتھیار تلف کر دیں تو مسلمان ممالک اور اسلامی تحریکیں بھی ان ہتھیاروں کی تباہی پر اصرار نہیں کریں گی۔ ہمارے پاس انسانیت کی بہبود کا پیغام ہے اور ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں انسان اپنے مسائل کے حل کے لیے اسلام کے عالم گیر پیغامِ اخوت و محبت کی طرف دھیان دے گا، چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں رہتا ہو لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے جبکہ مسلمان کمزور نہیں بلکہ قوی ہو۔ بقول اقبال:

ع عصانہ ہو تو کلیسیا ہے کارِ بے بنیاد

میں چند ایسی غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے پریس کی رپورٹوں سے پیدا ہوئی ہیں۔

میں نے کسی بھی جگہ طالبان کی مخالفت نہیں کی۔ البتہ یہ کہا ہے کہ ہم پاکستان میں طالبان والا نظام نہیں چاہتے۔ ہم پاکستان میں اپنے دستور پر عمل درآمد چاہتے ہیں جس

میں قراردادِ مقاصد اور اسلامی دفعات بھی شامل ہیں۔ ہم اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کی سفارشات اور فیصلوں کی روشنی میں غیر سودی نظام معیشت چاہتے ہیں۔ پاکستان کے ذمہ دار ترین علماء کا بھی یہی موقف ہے کہ پاکستان کے حالات کے مطابق اس ملک میں اسلام کا نفاذ دستوری جدوجہد کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ پاکستان کا دستور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات، وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے اور مختلف کمیٹیوں کی سفارشات اس کے لیے کافی مضبوط اور دیرپا بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

میں نے ہر جگہ کہا کہ امریکی ایڈمنسٹریشن، امریکی حکومت اور امریکی قوم میں فرق ہے۔ اسلام انسانیت کا دین ہے۔ یہ علاقے، رنگ، نسل اور زبان کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق نہیں کرتا۔ ہم دنیا کے کسی بھی حصے کے لوگوں کے دشمن نہیں ہیں بلکہ پوری انسانیت کے خیر خواہ ہیں البتہ ہم امریکی حکومت کی بعض پالیسیوں اور رویوں کو غیر عادلانہ، خلافِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک روار کھنے پر مبنی سمجھتے ہیں۔ میں نے پاکستان میں بھی امریکیوں کو قتل کرنے کی ہچکناہ باتوں کی مخالفت کی ہے اور شریعتِ اسلامی بھی جائز ویزے پر آئے ہوئے مہمان اور سفارت کار کو تحفظ دینے کی واضح ضمانت دیتی ہے۔ کسی صاحبِ علم کو زیب نہیں دیتا کہ وہ جائز ویزے پر آئے ہوئے غیر مسلم سیاحوں کو قتل کرنے کے فتوے جاری کر دے چاہے وہ دشمن ملک سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔

مستقبل کی دنیا، معلومات کے تبادلے اور باہمی رابطوں کی دنیا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب سے پوری دنیا ایک ایسی بستی بن گئی ہے جس میں تمام لوگ باہم مربوط ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اثر پذیر ہو رہے ہیں جو عقیدہ اور نظریہ برتر ہوگا، جس عقیدے کے ماننے والے مخلص اور اپنے عقائد کے مطابق سچے دل سے عمل کرنے والے ہوں گے جو رویہ انسانوں کے لیے نفع بخش ہوگا وہی عقیدہ و نظریہ اور وہی دین باقی رہے گا

۱۶۷ ————— مضامین قاضی حسین احمد

اور جو رو یہ انسانوں کے لیے مضر ہوگا وہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے اور جدید دور میں یہ حقیقت اور بھی کھل کر سامنے آنے والی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مسلمان محض زبانی جمع خرچ ہی نہ کرتے رہیں بلکہ قرآنی عقائد اور تصورات کو سیرت نبویؐ کی روشنی میں صحیح طور پر سمجھنے کی سعی کریں اور ان پر عمل کر کے دنیا کے سامنے اخلاقی طور پر برتر ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا  
رَابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حُلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ  
مِثْلُهُ ۚ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ  
جُفَاءً ۚ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَلِكَ يَضْرِبُ  
اللَّهُ الْأَمْثَالَ ۝ (الرعد ۱۳: ۱۷)

”اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔ پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں۔ اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین پر ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔“

(اکتوبر ۲۰۰۰ء)



## دورہ جاپان و چین — مشاہدات و امکانات

امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد اوائل مارچ میں جاپان اور چین کے ۱۵ روزہ دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ اس حوالے سے ہم نے ان سے کچھ سوالات کیے جن کے جواب انہوں نے مرحمت فرمائے۔ اس انٹرویو میں تعاون کے لیے ہم انور نیازی صاحب کے ممنون ہیں۔ (مدیر)

سوال: چین اور جاپان کے معاشروں میں آپ نے وہ کون سے پہلو دیکھے ہیں جن کی بنیاد پر وہاں اسلام کے فروغ کے امکانات کو وسیع کیا جاسکتا ہے؟

جواب: چین اور جاپان کے حالات اور معاشرے الگ الگ ہیں اور دونوں کا ایک جواب دینے کے بجائے ان کے بارے میں الگ الگ بات مناسب ہوگی۔ چین میں مجھے کوئی زیادہ وقت نہیں ملا، میں نے وہاں صرف تین دن گزارے ہیں اور اس دوران صرف سرکاری ملاقاتیں کیں۔ عوام کے اندر گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملا۔ چین ایک ارب ۲۵ کروڑ آبادی کا ملک ہے۔ اس کی ایک سرحد پاکستان اور افغانستان اور دوسری بحر الکاہل اور مشرق بعید کے ممالک کے ساتھ ملتی ہے۔ اتنی بڑی اور وسیع آبادی کے بارے میں صرف تین دن کی سرکاری اور رسمی ملاقاتوں کے بعد کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی۔ اس کے مقابلے میں جاپان رقبے کے لحاظ سے چھوٹا، ۱۰ کروڑ کی گنجان آبادی کا ملک ہے۔ یہاں مجھے زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ۱۲ دن کے دورے میں ہر طبقے کے لوگوں کے ساتھ رابطہ ہوا اور بے تکلفی کی فضا میں زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں ان سے تبادلہ خیال ہوا۔ وہاں پر رہنے والے ان پاکستانیوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جو سالہا سال سے وہاں رہائش پذیر

ہیں۔ جاپان کے بارے میں نسبتاً زیادہ معلومات کی بنیاد پر بہتر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چین کے حالات کے بارے میں بھی وہاں کئی سال سے رہنے والے پاکستانی احباب کی معلومات کی روشنی میں اظہار خیال کی کوشش کروں گا۔

اس دورے کے بارے میں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ جاپان کا دورہ میں نے جاپانی وزارت خارجہ کی دعوت پر کیا۔ اس کا اہتمام اسلام آباد میں جاپانی سفارت خانے نے کیا تھا۔ ان دوروں میں جماعت اسلامی کے امور خارجہ کے ذمہ دار عبدالغفار عزیز جو میرے معاون خصوصی ہیں، میرے ساتھ تھے۔

جاپانی معاشرے کا جو خاص پہلو مجھے نظر آیا وہ یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر لادین معاشرہ ہے۔ اس کا کوئی خاص مذہب نہیں ہے۔ اس میں کچھ روایات تو موجود ہیں جنہیں مذہبی اور کلچرل روایات کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن باقاعدہ کسی مذہب کے ساتھ وہاں کے لوگوں کی گہری وابستگی نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے بادشاہ کو تقریباً معبود کا درجہ حاصل تھا لیکن جنگ میں شکست سے جاپانی قوم شدید صدمے سے دوچار ہوئی اور ان کا اپنے بادشاہ کے بارے میں اعتماد متزلزل ہو گیا۔ بادشاہ نے بھی علامتی بادشاہ بننے کا راستہ اختیار کیا اور جاپان ایک مکمل جمہوری ملک بن گیا۔ اس سے قبل بھی پارلیمنٹ موجود تھی۔ ۱۸۹۰ء میں جاپان میں ایک آئینی بادشاہت تھی۔ ایک اصلاحی تحریک میجی کے نتیجے میں جاپانی معاشرے اور سیاست میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہی جاپان نے تعلیم اور ٹکنالوجی میں ترقی کرنا شروع کر دی تھی۔ یہاں کے دو بڑے مذاہب ہیں۔ ایک بدھ مت اور وہ بھی بدھ مت کا جاپانی ایڈیشن۔ دوسرا شنتو ازم (روایتی مذہب)۔ عیسائی مذہب بھی وہاں کے مذاہب میں شمار ہوتا ہے اگرچہ عیسائیت کے ماننے والوں کی تعداد ایک فیصد ہے۔ کیتھولک چرچ کی کوششوں سے عیسائیت کے بارے میں عام

جاپانیوں کو کچھ معلومات حاصل ہیں لیکن بائبل کے قصے کہانیاں تمام جاپانی بچوں کو معلوم ہیں۔

شنٹوازم اور بدھ مت کے ساتھ لوگوں کی وابستگی برائے نام ہے۔ ان کے بڑے بڑے معبد موجود ہیں لیکن ان کے اندر جا کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ عبادت خانے کی بجائے میوزیم ہیں اور لوگ سیر کی غرض سے وہاں آتے ہیں۔ ان کے روایتی مذاہب میں ایک اللہ اور خالق کا تصور موجود نہیں ہے، لیکن عموماً یہ اپنے آباؤ اجداد کی ارواح کے ساتھ رابطہ رکھنے، ان کی خاطر نذریں ماننے اور ان سے مدد اور برکت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی خوشی اور فلاح کی خاطر بہت سی رسومات سرانجام دیتے ہیں۔ لوگوں میں روحانی اور مذہبی طور پر ایک گہرا خلا موجود ہے جسے پر کرنے کے لیے عیسائی رومن کیتھولک چرچ سر توڑ کوشش کر رہے ہیں لیکن بڑے پیمانے پر کوئی پذیرائی نظر نہیں آتی۔ جاپانی فطرتاً ملنسار اور نرم خو ہیں۔ ان کی خواتین کو روایتی طور پر خدمت اور ادب کا درس دیا گیا ہے۔ مغربی اثرات کے باوجود جاپانی عورتیں اپنی اس روایت سے مکمل طور پر باہر نہیں نکل سکی ہیں۔ ہر بڑے ادارے میں استقبال لیے میں دو عورتیں عموماً موجود رہتی ہیں جو آنے والوں کے استقبال میں تقریباً رکوع کی سطح تک جھکتی ہیں اور مسکرا کر استقبال کرتی ہیں۔ خواہ آپ کہیں جائیں، کسی دکان یا دفتر میں جائیں، کسی گاڑی میں بیٹھیں، کسی سے آ منا سامنا ہو، ہر جگہ عام جاپانی بھی استقبالیہ کلمات کہتے ہیں اور جھک کر ملتے ہیں۔ انکسار اور ملائمت ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ بلند آواز سے بات نہیں کرتے۔ دوسرے کی بات غور سے سنتے ہیں۔ ان کے اس نرم اور ملائم رویے، انکسار اور تہذیب و ثقافت کی وجہ سے وہاں رہنے والے پاکستانیوں کا خیال ہے کہ جاپانیوں کی حقیقی رائے کے بارے میں لوگوں کو کم ہی پتا چلتا ہے۔

دین اور مذہب انسان کی فطری ضرورت ہے۔ کسی مافوق الفطرت ہستی کے سامنے



جھکنا انسانی طبیعت میں شامل ہے۔ جاپان کے لوگوں کی پرانی مذہبی روایات جدید علوم اور ٹکنالوجی کی پیش رفت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں اس لیے وہ اپنے اندر ایک روحانی پیاس محسوس کرتے ہیں۔ اسلام جو دین فطرت ہے جاپان میں اس کی اشاعت کے بہت امکانات موجود ہیں لیکن بد قسمتی سے اس سلسلے میں کوئی بڑی کوشش اب تک نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی حکومتیں ان لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو مسلمانوں کو بھی اپنے مذہب سے دور کرنے کی فکر میں ہیں؛ چہ جائیکہ نئی آبادیوں تک اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے اُمت کے وسائل کے استعمال پر سوچیں۔ مذہبی اور دینی تنظیموں کی تبلیغی کوششیں زیادہ تر مسلمانوں کی اپنی آبادی تک ہی محدود ہیں اور ان کے پاس عام معاشرے تک دعوت پہنچانے کے لیے وسائل موجود نہیں۔ جاپان میں جو تھوڑے بہت مسلمان موجود ہیں؛ وہ لیبر کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بڑی تعداد میں غیر قانونی طور پر وہاں رہ رہے ہیں جنہیں ہر وقت پولیس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ پاکستان کی لیبر کلاس میں بڑی تعداد دین سے وابستہ ہے لیکن غیر قانونی ہونے کی وجہ سے اطمینان کے ساتھ دین کا کام کرنے کا موقع انہیں میسر نہیں ہے جو لوگ خود غیر قانونی طور پر رہتے ہوں؛ وہ وہاں کی آبادی کو کیا متاثر کر سکتے ہیں۔

اس کے باوجود باہر کے مسلمانوں، خاص طور پر پاکستانی مسلمانوں نے بڑے شہر میں کچھ مساجد قائم کی ہیں جن کو انھوں نے اپنی تبلیغی کوششوں کا مرکز بنایا ہوا ہے۔ نو مسلم محدود تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں زیادہ تر جاپانی عورتیں ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ شادیاں کی ہیں۔ جاپانیوں سے ملاقات سے ہم نے محسوس کیا ہے کہ وہ اسلام کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں اور ان میں اسلامی تعلیمات کے لیے پذیرائی موجود ہے لیکن جاپانی زبان میں اسلامی کتب محدود تعداد میں ہیں۔ کوئی بھی کتاب ایسی نہیں ہے جو جاپان کے معیار پر بڑی تعداد میں شائع ہوئی ہو۔ جاپان کا ایک روزنامہ ایک کروڑ کی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔

کتابوں کو خریدنا اور پڑھنا عام جاپانی کا مشغلہ ہے۔ اس لیے وہاں پر ہر شہر میں کتابوں کی کئی کئی منزلہ بڑی بڑی دکانیں ملتی ہیں لیکن ان میں اسلام کے بارے میں کوئی کتاب بہ مشکل ملے گی۔

ٹوکیو میں ایک اسلام سنٹر قائم ہے لیکن اس کی آواز بہت نحیف ہے۔ جاپانی معاشرے میں مادی ترقی کے اس دور میں لوگوں کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے بہت موثر اور مضبوط آواز کی ضرورت ہے۔ اسلام کی ضرورت بھی موجود ہے اور جاپانی معاشرت تقاضا بھی کرتی ہے۔ ترقی کے باوجود وہاں کی عام اور گھریلو زندگی میں نفسا نفسی پائی جاتی ہے۔ ان حالات میں اسلام ان کی ضرورت ہے لیکن اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کسی بلند آہنگ آواز اور کوشش کی ضرورت ہے۔ اس وقت جاپانی معاشرہ مغربی میڈیا کے زیر اثر ہے اور امریکہ سے مرعوب ہے۔ مغربی میڈیا کا یہ پروپیگنڈا کہ مسلمان دہشت گرد اور انتہا پسند ہیں جاپان میں بھی عام ہے۔ اس تصور کے توڑ کے لیے اسلام کی حقیقی تعلیمات سے لوگوں کی آشنائی ضروری ہے۔ اسلام آباد میں جاپان کے سابق سفیر جنھوں نے میرے اس دورے کا اہتمام کیا تھا اس ضرورت کا احساس کر رہے تھے۔ ان کے دل میں اسلام کے لیے نرم گوشہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جاپانی اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کر سکیں۔ اسی طرح کے کچھ جاپانی دوست جاپان میں بھی موجود ہیں۔ انھیں قریب لاکر اس کام کا منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔ جاپان کی کوئی بڑی شخصیت کسی بڑے اشاعتی ادارے کے ذریعے سے اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو عام جاپانی کو اسلام کے بارے میں درست معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔

س: مغربی تہذیب کا مسلم معاشروں (بشمول پاک و ہند) اور ان مشرقی معاشروں نے جس طرح سے مقابلہ کیا اس میں کیا فرق ہے؟



ج: مشرق کا مسلم معاشرہ اپنی پسماندگی کے باوجود اور اسلام کے بنیادی عقائد سے قدرے انحراف کے باوجود بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ قرآن و سنت کی صورت میں مسلمانوں کے پاس حق و باطل میں تمیز کرنے کا ایک معیار (فرقان) موجود ہے۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے فرقان حمید کا نام دیا ہے یعنی حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والی کسوٹی۔ حضور کی پاکیزہ سیرت اپنی پوری تفصیل اور آب و تاب کے ساتھ اسلامی معاشرے میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ قرآن کے ساتھ اور نبی اکرم کے ساتھ محبت ہر مسلمان کا قیمتی سرمایہ ہے۔ چاہے کوئی کتنا ہی گنہگار مسلمان کیوں نہ ہو وہ قرآن اور حضور کے معیار حق ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے مغربی تہذیب اسلامی معاشروں کی بنیادوں کو ہلانے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور بظاہر مغربی تہذیب کے فروغ کے باوجود مسلمان اپنی بنیاد پر قائم ہیں۔ جب بھی مسلمانوں کو موقع ملتا ہے اپنی اس تہذیبی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جاپان اور چین دونوں کے معاشروں نے مغربی اقدار کو قبول کر لیا ہے۔ وہاں اس طرح کا کوئی معیار حق و باطل موجود نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ان میں اور مغربی معاشروں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بھی عیسائیت اس میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے کہ وہ مادی تہذیب کا مقابلہ کر سکے۔ مغربی معاشرہ عیسائی اخلاقیات کی بجائے جاہلی مادی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس کی اخلاقی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ یہی صورت چین اور جاپان کے معاشرے کی بھی ہے۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ معیار زندگی میں بہتری اور ٹکنالوجیکل طاقت کا حصول ہے۔

تہذیبی طور پر جاپان، چین اور مغربی ممالک میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ البتہ چونکہ نسل اور زبان میں نمایاں فرق ہے اور روایات اور تاریخ کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں اس لیے جاپان اور چین کا الگ الگ تشخص ہے۔ جاپان اور چین میں آپس میں گہری مغائرت ہے



اور ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کی وجہ سے ان میں باہمی اعتماد کی فضا نہیں ہے۔ مغربی ممالک خاص طور پر امریکہ کی کوشش ہے کہ جاپان اور چین ایک دوسرے کے قریب نہ آسکیں۔ جاپان پر امریکی تہذیب کا زیادہ اثر ہے۔ جاپان میں رہنے والے پاکستانیوں کا خیال ہے کہ ان کی نئی نسل امریکی تہذیب سے مرعوبیت کی حد تک متاثر ہے جب کہ چین اگلے دس برس میں امریکہ کے مقابلے کی طاقت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چین اپنے رقبے، وسائل اور صلاحیت و قابلیت کے لحاظ سے بڑا ملک ہے اور اسی وجہ سے اس کے اندر ایک اعتماد بھی موجود ہے۔

س: ان معاشروں میں عورت کا کیا کردار ہے اور وہ کن مسائل سے دوچار ہے؟  
 ج: جاپانی معاشرے میں عورت روایتی طور پر مرد کی خدمت کے لیے اور اس کو خوش رکھنے کے لیے ہے۔ مغربی معاشرے میں بھی یہ ظاہر عورت کی مرد سے برابری اور اختیارات میں شریک کرنے کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود عورت دل بہلانے کی چیز ہے۔ عورت کو جاپان میں اور مغربی معاشرے میں بھی گھر کی خدمت کے ساتھ ساتھ کام پر بھی لگایا گیا ہے۔ اس کو اپنی روزی خود کمائی پڑتی ہے۔ شادی کو ایک تکلف ہی بنا دیا گیا ہے اور اس سے جان چھڑانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جاپان میں مغربی تہذیب کے اثرات کے تحت اگرچہ بظاہر عورت کی آزادی کا دعویٰ کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں عورت نہ آزاد ہے نہ اس کو حقوق حاصل ہیں اور نہ ہی اس کے اندر اعتماد ہے۔ عورت کا احترام بھی موجود نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اگر کسی جاپانی عورت کو کسی مسلمان سے شادی کرنے کا موقع مل جائے تو وہ اسلام بھی قبول کر لیتی ہے اور مسلمان خاوند کے ساتھ خوش بھی رہتی ہے۔ بہت سارے پاکستانی نوجوانوں نے جاپانی خواتین سے شادیاں کی ہیں اور وہ بہت اچھی اور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔

س: چین میں اشتراک کی تجربہ آپ نے کس حال میں پایا؟

ج: چین کا معاشرہ مرکزی طور پر منضبط معاشرہ ہے، لیکن خود چینی قیادت کے کہنے کے مطابق جب انھیں ۱۹۴۹ء میں آزادی ملی تو اقتصادی میدان میں انھوں نے روسی تجربے کو اپنایا جس کے نتیجے میں وہ تیزی کے ساتھ ترقی نہ کر سکے۔ اگرچہ انھیں کچھ فوائد حاصل ہوئے لیکن جب سے انھوں نے مارکیٹ اکانومی اپنائی ہے ان کی مجموعی قومی پیداوار میں سات فیصد سے لے کر ۱۳ فیصد تک سالانہ ترقی ہو رہی ہے جو دنیا میں بلند ترین شرح اضافہ ہے۔ چینی معیشت بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اور وہ دنیا کی بہت بڑی معیشت بننے کی طرف رواں دواں ہے۔ اس وقت ہانگ کانگ کو ساتھ ملانے کے بعد ایک ملک اور دو نظام کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اشتراک کی نظام کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ جہاں تک لوگوں کی تنظیم اور آبادی کو کنٹرول میں رکھنے کا تعلق ہے تو انھوں نے ابھی تک اس طرح کی پابندیاں برقرار رکھی ہیں کہ معاشرے پر ان کی گرفت ڈھیلی نہ پڑ جائے۔ چین میں رہنے والے ایک پاکستانی نوجوان کے کہنے کے مطابق چین کی بنیادی فکر مندی ان کی اقتصادی ترقی اور مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہے اور ان کا اشتراک نظریے کے ساتھ برائے نام تعلق ہے۔ البتہ اپنے ملک کی ریاستی خود مختاری اور سالمیت کے بارے میں چینی بہت حساس ہیں اور وہ سکیناٹنگ، تبت اور تائیوان کو چین کا ٹوٹا انگ سمجھتے ہیں۔

س: اکیسویں صدی میں امریکہ کے گلوبل امپریل ازم کے خلاف چین و جاپان اور مسلم ممالک میں مفاہمت کے کیا امکانات ہیں اور اس کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جاسکتا ہے؟

ج: جاپان میں میری یہ کوشش رہی کہ میں جاپانیوں کے ذہن میں یہ بات ڈال سکوں

کہ امریکہ کی یہ کوشش ہوگی کہ جاپان کو بھارت کا ٹکنالوجیکل اور مالیاتی پشتی بان بنادے اور اس طرح دونوں کو ملا کر چین کے مقابلے میں کھڑا کر دے۔ اسی لیے وہ پاکستان کو بھی دباؤ میں لا کر بھارت کی بالادستی قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ ایشیائی کو ایشیائی کے مقابلے میں کھڑا کر کے گلوبل امپریل ازم قائم کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ کے ہاتھوں استعمال ہونے کے بجائے اگر جاپان اور چین کے درمیان قریبی تعلقات قائم ہو جائیں اور یہ دونوں ممالک مسلم ممالک کے ساتھ بھی گہرا قریبی تعلق قائم کر لیں تو دنیا کو عدل و انصاف پر مبنی ایک صورتحال مل سکتی ہے جس کے ذریعے سے انسانی آبادی کسی نئے امپریل ازم سے بچ سکتی ہے۔ چین اور جاپان کے درمیان باہمی اعتماد کی کمی اس میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جاپان کو امریکہ نے مکمل طور پر اپنا تابع بنایا ہوا ہے۔ اس کو ایٹمی چھتری فراہم کی ہے اور اس کو چین اور شمالی کوریا کے ایٹمی اور روس کے فوجی تسلط سے بچانے کی ضمانت فراہم کر رکھی ہے۔ اس کے بدلے میں امریکہ نے جاپان کی خارجہ پالیسی کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔

جاپان میں لوگوں نے میرے ساتھ ہر ملاقات میں پاکستان کے نیوکلیر پروگرام کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔ اس بات سے وہ انکار نہیں کرتے کہ جنگ عظیم دوم میں جاپان کے پاس نیوکلیر طاقت ہوتی تو امریکہ اس پر ایٹم بم نہ گراتا۔ انھیں اچھی طرح اس بات کا احساس ہے کہ جاپان کو جرمِ ضعیفی کی سزا دی گئی ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ آج تک جاپانی نہیں سمجھ سکے کہ انھیں کیوں وحشیانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ جو جوہات بیان کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ امریکہ کو یہ خدشہ تھا کہ اس نے جلد جاپان پر قبضہ نہ کیا تو روس جاپان پر قبضے کے لیے پیش قدمی کر سکتا ہے۔ اس حملے کا ایک مقصد یہ تھا کہ مستقبل کے دشمن روس کو بتادیں کہ ان کے پاس یہ



وحشیانہ ہتھیار موجود ہیں۔ جاپانی بہ ظاہر ایٹم بم سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ اگر وہ فیصلہ کر لیں تو ایک ہفتے کے اندر اندر ایٹم بم بنا سکتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے پوری تیاری کر رکھی ہے۔ وہاں ایسی سیاسی لابی بھی موجود ہے جس کا خیال ہے کہ وہ چین، امریکہ، روس اور شمالی کوریا کی بڑی ایٹمی طاقتوں کے اندر گھرے ہوئے ہیں اور ایک بہت بڑی مالیاتی اور ٹکنالوجیکل طاقت ہونے کی وجہ سے وہ ان عالمی قوتوں کے حسد کا بھی نشانہ بنے ہوئے ہیں اس لیے ان کو کسی وقت اپنے دستور میں ترمیم کر کے اپنی دفاعی ضروریات کے مطابق بجٹ میں اضافہ کرنے اور ایٹمی طاقت بننے کا اعلان کرنا پڑے گا۔

جاپان کے ساتھ مسلسل رابطہ قائم کر کے ان کو اس بات پر آمادہ کرنے کی ضرورت ہے کہ امریکی پلان کے زیر اثر چین کے مقابلے میں محاذ آرائی کی بجائے ان کے لیے زیادہ بہتر، مثبت اور باوقار عالمی رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک آزادانہ پالیسی اختیار کر کے پاکستان، وسط ایشیا اور دوسرے ممالک کی ٹکنالوجیکل ترقی کا ذریعہ بنے اور اس طرح عالمی طاقتوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کا موثر کردار ادا کرے۔ یہ مستقبل کی عالمی سیاسی صورت گری کرنے والوں کے لیے ایک اہم موضوع ہے جس پر پاکستان اور دیگر مسلمان ممالک کے دانشوروں کو کام کرنا چاہیے۔

س: ان معاشروں کی وہ اچھی باتیں کیا ہیں جو ہم قومی اور تحریکی سطح پر اختیار کر سکتے ہیں؟

ج: جاپانی معاشرے کی سب سے اچھی خوبی اس کی قومی سوچ ہے۔ جاپانی قومی سوچ رکھتے ہیں۔ اپنی ذات کی بجائے وہ ہمیشہ قومی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ منصوبہ بندی جاپانیوں کی عادت ہے۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں منصوبہ بندی، قومی منصوبہ بندی

کا حصہ ہوتی ہے۔ ہر جاپانی دوسرے جاپانی پر مکمل اعتماد کرتا ہے اور ان کی منصوبہ بندی اتنی تفصیلی، ٹھیک اور درست ہوتی ہے کہ اگر آپ نے ریلوے کے کسی ڈبے میں ریزرویشن کرائی ہے تو ریلوے اسٹیشن پر آپ کے کھڑے ہونے کا مقام بھی اس ریزرویشن میں لکھا ہوتا ہے اور اس مقام کی نشان دہی ریلوے اسٹیشن پر کی گئی ہوتی ہے۔ آپ نے جا کر صحیح اس جگہ پر کھڑا ہونا ہوتا ہے اور بلٹ ٹرین ۵ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے ہوئے اس انداز سے اسٹیشن پر آ کر رکتی ہے کہ آپ کے ڈبے کا دروازہ آپ کے سامنے آ کر رکتا ہے۔

۱۰ کروڑ کی آبادی کو مکمل طور پر تعلیم دی گئی ہے۔ 99.8 فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ نو سال کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۹۰ فیصد طلبہ ثانوی تعلیم میں داخلہ لیتے ہیں اور وہاں سے فارغ ہونے والی ۶۰ فیصد تعداد یونیورسٹی میں داخلہ لیتی ہے۔ ساری قوم کو پوری طرح سے علم سے آراستہ کیا گیا ہے۔ تعلیم ہی ان کا بنیادی وسیلہ ہے۔ ایک جاپانی پروفیسر ہیراشیما نے جو چار سال تک لاہور میں رہے ہیں مجھ سے کہا کہ پاکستان کے خلاف گہری سازش کی گئی ہے کہ اس کی مخفی ذہین اور محبت وطن قوم کو علم سے محروم رکھا گیا ہے۔ یہ استعماری سازش کا نتیجہ ہے اور اس میں جاگیرداروں نے استعمار کے ایجنٹ کا کردار ادا کیا ہے۔ جاپان نے اسی تنظیم، علم اور ٹکنالوجی سے مسلح کرنے کے نتیجے میں پوری آبادی کو کام پر لگا رکھا ہے۔ جاپان میں کپاس نہیں ہوتی لیکن وہ کپڑے کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ جاپان میں پٹرول باہر سے درآمد ہوتا ہے لیکن وہ گاڑیوں کا سب سے بڑا مینوفیکچرر اور برآمد کنندہ ہے۔ جاپان میں لوہا باہر سے درآمد ہوتا ہے لیکن اس کی مشینری پوری دنیا میں جاتی ہے اور اس کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ اس کا علم اور ہنر ہی اس کی طاقت کا راز ہے۔ یہی منصوبہ بندی سیکھنا ہمارا فرض ہے۔ چین بھی کم و بیش اسی راستے پر گامزن ہے۔

تحریکی سطح پر ہمیں جاپان اور چین کی اصلاحی تحریکوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

چینی لیڈروں نے ذاتی قربانی دے کر اور مثال قائم کر کے اپنی پوری قوم کو بے غرض اور بے لوٹ جدوجہد پر آمادہ کیا ہے۔ رضا کار اساتذہ اور ڈاکٹروں کی بڑی بڑی ٹیمیں منظم کی گئی ہیں اور لوگوں کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تعلیم کو مال بنانے کا ذریعہ بنانے کے بجائے خدمت کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ جاپان میں اس وقت بھی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے اور نصاب اور درسی کتب پر تحقیق کے ادارے موجود ہیں جو اس میں مسلسل اصلاح کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ چین اور جاپان کی تنظیم اور ترقی کار ازان کی اصلاحی تنظیموں کا مرہون منت ہے۔ کسی بھی قوم کی تاریخ پڑھ لیں، کبھی بھی اوپر سے مسلط کی گئی قیادت ترقی و اصلاح میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکی بلکہ ہمیشہ تبدیلی اور انقلاب سے پہلے مصلحین قوم کے اندر بیداری پیدا کرتے ہیں۔ بیداری پیدا کرنے کے نتیجے میں ایک تحریک اٹھتی ہے۔ تحریک کے مخلص، بے لوٹ کارکنوں کے ہاتھ میں جب اختیارات آتے ہیں تو وہ پوری قوم کو ترقی اور عروج کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں دو بڑے مصلحین علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ نے قوم کو یہی درس دیا۔ پوری قوم کا فرض ہے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں ان مصلحین کی آراء اور کوششوں کے مطابق اپنے آپ کو منظم کریں اور عروج کے راستے پر گامزن ہوں۔

ہمارے پاس اللہ کی دی ہوئی رہنمائی موجود ہے اور ہم اللہ کے آخری پیغام کے حامل اور علم بردار ہیں۔ اگر ہم اس کی روشنی میں اپنا سفر طے کریں گے تو ہم نہ صرف اپنے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کما سکتے ہیں بلکہ مادی ترقی کے باوجود دنیا جس طرح عالمی سطح پر مضطرب ہے اسے بھی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی سکون کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔ دنیا و آخرت کی بھلائی کے اس راستے پر گامزن ہونے کے لیے آہنگ کو بلند کرنے اور قدم کو تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ (مئی ۲۰۰۰ء)



## تحریک اسلامی اور عالمی تناظر

جماعت اسلامی قومی اور بین الاقوامی دائروں میں جن پالیسیوں پر عمل پیرا ہے ان کے بارے میں مختلف آرا کا اظہار کیا جاتا ہے۔ موجودہ عالمی تناظر میں جماعت اسلامی کی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟ پاکستان اور بھارت کے حوالے سے کیا جماعت اسلامی کو کوئی نئی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے؟ خاص طور پر کشمیر میں جو جہاد اس وقت برپا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ جماعت اسلامی اس میں کیا نتائج حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل ہے؟ یہ ایسے اہم اور بنیادی سوالات ہیں جن کے بارے میں ہر سوچنے والا شخص خاص طور پر جسے اسلامی تحریک کے مستقبل سے دلچسپی ہے سوال کرتا ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ عالمی تناظر میں اسلامی تحریکوں کے پورے لائحہ عمل کو سامنے رکھ کر اس میں مقامی سطح کے مسائل کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

کسی بھی جگہ اسلامی تحریک کی حکمت عملی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند اساسی اور بدیہی حقائق کو سامنے رکھا جائے۔

- ۱۔ کسی بھی معاملے میں کوئی روش اختیار کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس بارے میں قرآن و سنت سے ملنے والی راہنمائی کیا ہے اس لیے کہ ایک مسلمان کے نزدیک قرآن و سنت آخری پیغام ہے جو اللہ نے انسانیت کی راہنمائی کے لیے قیامت تک ایک ہی واحد راستے کے طور پر بھجوایا ہے۔

۲- اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور اس کے پاس ایک عالم گیر پیغام ہے اور یہ پیغام ساری انسانیت کے لیے ہے۔

۳- موجودہ دنیا کی جو جغرافیائی تقسیم ہے اور جو قومی ریاستیں بنی ہوئی ہیں، ہم فی الوقت ان کی جغرافیائی حدود کے اندر رہتے ہوئے اور ان کے آئین اور قانون کا احترام کرتے ہوئے ہی پر امن دعوتی جدوجہد جاری رکھ سکتے ہیں۔

اس جدوجہد میں عدل و انصاف کے بنیادی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف مسائل کے بارے میں پالیسی طے کرتے ہیں۔

اسلامی تحریکیں مختلف ممالک کے مخصوص جغرافیائی اور سیاسی حالات کی وجہ سے پوری دنیا میں کوئی ایک لائحہ عمل طے کر کے ایک تنظیم کی صورت میں کام نہیں کر سکتیں۔ اس لیے وہ ہر ملک کے حالات کے پیش نظر الگ الگ حکمت عملیاں اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ جہاں مطلق العنان بادشاہتیں قائم ہیں یا آمرانہ نظام حکومت ہے اور جماعت سازی اور اظہار رائے پر پابندی ہے، وہاں اور جس جگہ کھلی آزادی ہے، جماعت بنانے کی اور پریس کی آزادی ہے اور قانون کی حکمرانی ہے، دونوں مقامات میں الگ الگ حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان ایک غیر مسلم اکثریت کا ملک ہے اور پاکستان ایک مسلم اکثریت کا ملک ہے جس کا دستور بھی اسلامی ہے اور قرارداد مقاصد کے تحت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قرآن و سنت کی راہنمائی کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ان دونوں ممالک کی اسلامی تحریکیں ایک پالیسی کے تحت کام نہیں چلا سکتیں۔ دونوں ممالک میں باہمی تنازعات ہیں اور کشمیر جیسا مسئلہ موجود ہے، اس کے بارے میں بھی دونوں ممالک کی اسلامی تحریکوں کی اپنی مصلحتیں ہیں، لیکن دونوں ممالک کی تحریکیں اسلامی اصولوں کے باعث اس بات کی پابند ہیں کہ ان کا موقف حق پر مبنی ہو۔

اگر عالمی تناظر کو پیش نظر رکھا جائے تو ایک طرف امریکہ کے مقاصد ہیں جو اپنی واحد سپر پاور کی حیثیت منوانا چاہتا ہے اور اس کی کوشش ہے کہ دنیا بھر کے تمام تنازعات اس کی مرضی کے مطابق حل ہوں۔ وہ دنیا کے لیے جو نقشہ مرتب کرے سارا عالم اس کے مطابق چلے۔ امریکہ کی خواہش ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی اور برابر کی طاقت نہ اُبھر سکے اور دوسری تمام ان طاقتوں کو جن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قریب یا دور کے مستقبل میں اس کے لیے چیلنج بن سکتی ہیں زیادہ طاقتور بننے سے روکا جائے۔ مستقبل قریب میں اسے یہ خدشہ عوامی جمہوریہ چین سے ہے اس لیے چین کا گھیراؤ کرنا اس کے گرد حصار باندھنا اور اسے اندر سے توڑنا امریکہ کی ایسی بنیادی خواہش ہے جو مشرق بعید جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا میں اس کی پالیسیوں کو متاثر کرتی ہے۔ سابق سوویت یونین کو توڑنے اور روس کو اقتصادی طور پر زیر کرنے کے بعد اس کی کوشش ہے کہ روس دوبارہ طاقت حاصل نہ کر سکے اور داخلی پریشانیوں میں الجھار ہے۔

امریکہ کے لیے بہت بڑا نظریاتی چیلنج جو دور کے مستقبل میں اس کے سامنے ہے اور مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام میں اس کی پالیسیوں کا محور ہے وہ عالم گیر اسلامی تحریک کا وجود ہے۔ امریکہ میں پالیسی پر اثر انداز ہونے والے دانشوروں کی غالب اکثریت اسلامی تحریک کو انسانیت کی فلاح کے لیے ایک مثبت کوشش اور طاقت ماننے سے منکر ہے۔ اس کے برعکس وہ اسے عالمی امن کو تباہ کرنے کا سب سے بڑا عامل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان دانشوروں کی رہنمائی کی وجہ سے اسلام کو تشدد انتہا پسندی اور عسکریت کا مترادف قرار دینا مغربی میڈیا کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ مغرب کی یہ کوشش ہے کہ عالم اسلام متحد نہ ہونے پائے اور اسلامی تحریکوں کو اپنے اپنے ممالک میں بدنام کیا جائے اور مسلمانوں کے حکمرانوں کو آلہ کار بنا کر خود مسلمانوں کے وسائل کو اپنے اپنے ملک میں اسلامی تحریکوں کے خلاف



استعمال کیا جائے۔ عوام اور حکومتوں میں خلیج پیدا کی جائے۔ خاص طور پر مسلمان ممالک کی افواج اور عوام کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا جائے۔

امریکہ کا منصوبہ ہے کہ کمزور اور چھوٹے ممالک کو علاقائی منی سپر پاورز کی سرپرستی میں دے دیا جائے۔ اس کے لیے مسلمانوں کے علاقے میں ایک طرف اسرائیل اور دوسری طرف بھارت کو منی سپر پاور بنایا جائے اور دونوں کے تعاون سے انڈونیشیا سے لے کر ترکی تک تمام مسلمانوں کو کنٹرول کیا جائے۔ مسلمانوں میں کسی کو بھی امریکہ فوجی لحاظ سے اپنے دفاع کے قابل نہیں دیکھنا چاہتا اور سیاسی اور معاشی طور پر بھی وہ انہیں اپنا دست نگر رکھنا چاہتا ہے۔ امریکہ اپنے اس منصوبے کے تحت جنوبی ایشیا میں بھارت کو منی سپر پاور بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ چین کے خلاف بھی اسی طرح سے یہ حصار مکمل ہو سکتا ہے کہ بھارت کے ذریعے پاکستان اور بنگلہ دیش کو عالم اسلام سے کاٹ کر بھارت ہی کی سرپرستی میں دے دیا جائے تاکہ پورے بلاک کو چین کے خلاف استعمال کیا جاسکے۔ اسی طرح عرب ممالک کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر اسرائیل کو اس علاقے میں منی سپر پاور بنایا جائے۔ بھارت اور اسرائیل دونوں کو امریکی سرپرستی حاصل ہے۔

دوسری طرف روس سے آزاد ہونے والے مسلمان علاقے یعنی وسطی ایشیا کی مسلمان جمہوریتوں اور قفقاز کے علاقے میں انتشار برپا کر کے ان کو غیر مستحکم رکھا جائے تاکہ ترکی سے لے کر پاکستان تک کے مسلمان ممالک جن میں ترکی، ایران، افغانستان اور وسط ایشیا کی چھ مسلمان جمہوریتوں کے علاوہ قفقاز اور تاتارستان کے مسلم علاقے شامل ہیں، مستقبل بعید میں بھی ایک اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی وحدت بننے کی طرف قدم نہ بڑھا سکیں۔ اسلام دشمن طاقتیں اس بات کو بھی یقینی بنانا چاہتی ہیں کہ مراکش اور یمن تک پھیلا ہوا عالم عرب اور مشرقی یورپ سے لے کر مشرقی ترکستان تک پھیلی ہوئی ترک اقوام آپس میں اکٹھی نہ ہو

سکیں۔ ان کی زبان، علاقہ اور نسل ایک ہے لیکن ان کو آپس میں منتشر رکھا گیا ہے۔ اسی طرح انڈونیشیا، ملائیشیا، بنگلہ دیش اور پاکستان بڑی بڑی مسلم آبادیاں ہیں، انھیں بھی داخلی طور پر عدم استحکام کا شکار رکھا گیا ہے۔

مسلم دنیا کے علماء، دانشوروں، پالیسی ساز اداروں اور اسلامی تحریک کے لیے مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے والوں کے سامنے اہم ترین سوال یہ ہے کہ انتشار کی جو کیفیت اس وقت عالم اسلام میں نظر آ رہی ہے، کیا اسے ہمیشہ کے لیے ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کر لیا جائے یا پالیسی طے کرتے وقت اس امکان کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ عرب ممالک، ترک ممالک، افریقہ کے مسلمان ممالک جن میں نائیجیریا اور سوڈان جیسے بڑے ممالک شامل ہیں۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، بنگلہ دیش، افغانستان اور پاکستان مستقبل کے کسی دور میں مخلصانہ طور پر بیرونی اثرات سے آزاد ہو کر معاشی، تہذیبی اور سیاسی تعاون کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس سوال کے درست جواب کی روشنی میں ہم اپنا درست لائحہ عمل بنا سکتے ہیں۔

عالم اسلام کی بیسویں صدی کے اوائل کی اور موجودہ صورت حال کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ جیسے غلبہ اسلام کا کوئی منصوبہ مرحلہ بہ مرحلہ زیر تکمیل ہے۔ احیائے اسلام کی تحریکوں نے اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ اس لیے مغرب کا ہدف ہیں۔ یہ کئی ممالک میں عوام کی اُمیدوں کا مرکز بن گئی ہیں۔ کئی ممالک میں اسلامی نظام کے تجربات ہو رہے ہیں۔ کشمکش کا یہ دور مستقبل کے لیے ایک اچھی علامت ہے۔

اس بات کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ عالم اسلام ایک حقیقت ہے اور اسلام ایک بڑی قوت اور مستقبل کے نظام کے طور پر نہ صرف عالم اسلام کی بلکہ پورے عالم انسانیت کی ضرورت ہے۔ اس وقت ذرائع ابلاغ کی تیز رفتاری کی وجہ سے تمام دنیا کے انسان ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ دنیا ایک عالمی گاؤں بن گئی ہے اور اس میں رہنے

والے ایک خاندان بن گئے ہیں۔ ان کے باہمی رابطے بڑھ گئے ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا ایک اکائی ہو گئی ہے اور ٹکنالوجی کی مسلسل ترقی کے نتیجے میں یہ ملاپ اور زیادہ قوی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جغرافیائی سرحدیں نظریات، خیالات، افکار اور عقائد کو پابند نہیں کر سکتیں۔ اگر بے حیائی اور فحاشی پھیل رہی ہے تو دوسری طرف انسانیت کے لیے مفید علم اور آداب بھی پھیل رہے ہیں۔ مضطرب انسانیت کو جس حق کی تلاش ہے اس حق کو ہمیشہ کے لیے اوجھل نہیں رکھا جاسکتا۔ جھوٹے پروپیگنڈے کا گرد و غبار جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا اور باطل کے ہتھکنڈے بھی جو شیطان کا پھیلا یا ہوا عنکبوت کا گھر وندا ہے یہ بہت ہی کمزور گھر وندا ہے اسے بھی بالآخر ختم ہو جانا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تحریک اسلامی کے رہنما ہر جگہ اپنی حکمت عملی طے کرتے وقت صبر اور حکمت سے کام لیں اور یقین و ایمان سے سرشار ہو کر پیش قدمی کرتے رہیں۔

بعض لوگ اس بات کو ایک امر واقعہ کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ یہ ایک ”یک قطبی“ دنیا ہے۔ بالآخر امریکہ غالب ہو کر رہے گا۔ امریکہ نے پوری دنیا کے لیے جو حکمت عملی ترتیب دی ہے اسے ہی کامیاب ہونا ہے۔ خوف زدہ کرنے کے لیے وہ یہ تاثر پھیلاتے ہیں کہ امریکہ اپنے سیٹلائٹ کیمروں کے ذریعے سے انسان کے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی بھی دیکھ رہا ہے اور پوری دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی مادی حرکت بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح امریکہ کو قادر مطلق اور عالم الغیب والشہادۃ بنا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ ساری دنیا کے لوگ اس غلامانہ کیفیت میں مبتلا ہو جائیں اور امریکہ کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اپنی آزادی سے دست بردار ہو جائیں اور اپنے آپ کو اس کے مفادات کا تابع بنا لیں اور اس کی عالمی مصلحتوں کو پورا کرنے میں اپنی عافیت سمجھیں۔ امریکہ کے مفادات کے لیے کام کرنے والے کارندے پوری دنیا میں تمام کمزور اقوام اور عوام کو یہی سمجھا رہے ہیں کہ



امریکہ کی مصلحت کو سامنے رکھ کر اس کی خوشنودی کے ساتھ اپنے لیے علاقے میں کوئی مقام بنایا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ خود اخلاقی اور تہذیبی انتشار کا شکار ہے۔ معاشی اعتبار سے بھی ابھی دس سالہ کساد بازاری سے نکلا ہے مگر معیشت غیر مستحکم اور مالی اعتبار سے ایک غبارے کی مانند ہے جس سے کبھی بھی ہوا نکل سکتی ہے۔ عسکری اعتبار سے بظاہر مضبوط ہے لیکن جو فوج مرنے سے ڈرتی ہو وہ کوئی عالمی کردار ادا نہیں کر سکتی، خصوصیت سے اپنی سرحدوں سے دور۔ کہنے کو تو وہ ایک سپر پاور ہے لیکن اس کے دائمی غلبے کا تصور ایک واہمہ ہے۔

اگر پاکستان میں ہم امریکہ کی بالادستی تسلیم کر لیں اور اس لابی کی نصیحت تسلیم کرنے میں اپنی عافیت سمجھیں تو ہمارے لیے سیدھا سادا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے ایٹمی پروگرام سے دستبردار ہو جائیں، میزائل ٹکنالوجی کے کام کو آگے بڑھانا چھوڑ دیں، فوجوں کی تعداد اس حد تک کم کریں کہ ہماری داخلی سیکورٹی کے لیے کافی ہو اور بھارت کے لیے کوئی چیلنج نہ رہے، علاقے میں بھارتی بالادستی تسلیم کر لیں اور کشمیر کا کوئی ایسا حل مان لیں جو بھارت اور امریکہ کے لیے قابل قابل ہو جس میں کنٹرول لائن کو مستقل سرحد بنانے کی تجویز بھی شامل ہے۔

ہمارے ملک میں ایک ایسی بھارت نواز لابی موجود ہے جو بھارت سے دوستی کے پردے میں بھارتی بالادستی کے لیے استدلال پیش کرتی رہی ہے۔ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ انھیں مسلم اُمت اور پاکستان سے زیادہ بھارت کے مفادات عزیز ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بھارت اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس وقت وہاں ۷۱ مرکز گریز تحریکیں چل رہی ہیں جو آزادی یا نیم آزادی کی داعی ہیں۔ پاکستان ساری خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود معاشی اعتبار سے بھارت سے بہتر ہے۔ ورلڈ ڈویلپمنٹ رپورٹ

۹۹-۱۹۹۸ء کے مطابق پاکستان میں سالانہ فی کس آمدنی ۳۹۰ ڈالر تھی جبکہ بھارت میں یہ ۳۹۰ ڈالر سالانہ تھی۔ غربت کی صورت حال بھی بھارت میں ۴۱ فیصد۔ پاکستان میں ایک ڈالر روزانہ آمدنی والے افراد آبادی کا 11.61 فیصد تھے جبکہ بھارت میں 52.5 فیصد۔ اسی طرح دو ڈالر یومیہ آمدنی سے کم والی آبادی کا تناسب پاکستان میں ۵۷ فیصد تھا اور بھارت میں 88.8 فیصد۔ بھارت جو کچھ اپنے دفاع پر خرچ کر رہا ہے اس کے نتیجے میں اس کا حشروس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ دیکھنے والوں کو یہ سب کچھ نظر آ رہا ہے۔

اگر اس لابی کی بات کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان عالم اسلام کی قیادت نہ کرے اور قوموں کی صف میں اپنے لیے ممتاز اور نمایاں مستقبل تلاش کرنے کی کوشش سے باز آ جائے افغانستان اور وسطی ایشیا کی طرف نہ دیکھے اور اس پورے علاقے کو امریکہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دے یا زیادہ سے زیادہ امریکی آلہ کار کے طور پر بھارت کی سرپرستی میں رہ کر وسط ایشیا اور افغانستان میں وہ رول ادا کرے جو یہ دونوں طاقتیں مل کر اسے تفویض کریں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ پاکستان یا تحریک اسلامی کے لیے اس حکمت عملی کو اپنالیں۔ ہم اسلام کو اللہ کی طرف سے آخری پیغام سمجھتے ہیں۔ اسے انسانیت کی فلاح کا ضامن سمجھتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان کو اسلام کے دامن میں ہی سکھ اور چین مل سکتا ہے۔ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لیے بھارت اور امریکہ سے سیاسی تہذیبی اور معاشی آزادی ضروری ہے جس کے لیے اقتصادی خود کفالت اور دفاعی قوت کا حصول ایک ناگزیر امر ہے۔ اگر ہم کشمیر سے دست بردار ہو کر کشمیری مجاہدین کا ساتھ چھوڑ دیں اور کشمیر کو بھارت کے حوالے کر دیں تو یہ ہمارے زوال اور پستی کا آغاز ہوگا۔ بھارت اس پر اکتفا نہیں کرے گا کیونکہ غاصب فتح کے بعد قناعت نہیں کرتا بلکہ

پاکستان کو مکمل طور پر باج گزار طفیلی ریاست بنانے کے لیے آگے بڑھے گا۔ پاکستان میں سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کی کوشش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے ہمہ جہت سائنسی ترقی کی طرف قوم متوجہ ہے، اس کی ایک وجہ عالمی سطح پر بھارت کے مقابلے کا داعیہ ہے۔ بھارتی بالادستی تسلیم کرنے کے بعد یہ داعیہ ختم ہو جائے گا۔ اپنے دفاع کو بھارت کے حوالے کر کے آگے بڑھنے کا جذبہ ماند پڑ جائے گا۔ پھر اقتصادی لحاظ سے پاکستان کا استحصال کیا جائے گا۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ امریکہ نہیں چاہتا کہ پاکستان اور بھارت میں مفاہمت ہو اور دونوں مل کر امریکہ پر دباؤ ڈالیں، مگر یہ لوگ چین کے گرد امریکی حصار کی بات کرتے ہیں جس کے لیے بھارت امریکہ اور روس کی مشترکہ حکمت عملی یہ ہے کہ پاکستان کا ایٹمی میزائل پروگرام راستے سے ہٹ جائے تاکہ جنوب سے چین کا محاصرہ کر لیا جائے۔ عالم اسلام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا یہ پورا کام پاکستان اور بھارت کی مفاہمت سے نہیں بلکہ پاکستان کو ایک طفیلی ریاست اور بھارت کو علاقائی منی سپر پاور بنا کر ہی ہو سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ امریکہ، پاکستان اور بھارت میں مفاہمت نہیں چاہتا۔ اگر بھارت کے ارباب دانش اپنے حکمرانوں کو یہ سمجھا سکیں کہ وہ پاکستان اور چین سے اپنے تعلقات درست کر کے بھارت کو امریکی اثرات سے بچائیں تو اس کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ کشمیر میں اپنی ہٹ دھرمی اور کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ کہنے کی عادت چھوڑ دیں اور کشمیریوں کی خواہش کے مطابق کشمیر کا فیصلہ کرنے دیں۔ اس طرح سے بھارت اور پاکستان کی مفاہمت کے ذریعے سے اس علاقے میں امریکہ کی مداخلت کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔ بھارت یہ اس لیے نہیں چاہتا کہ وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستیں افغانستان، ایران، ترکی اور پاکستان مل کر ایک بڑی سیاسی اور اقتصادی طاقت ہیں۔ بھارت مستقبل کی اس طاقت سے خوفزدہ ہے۔



بھارت میں پندرہ کروڑ سے زائد مسلم آبادی ہے۔ بھارت کے نچلے طبقات کے عوام اور مسلمان مل کر برہمن حکمران اور کھتری طبقات کے مقابلے میں اکثریت میں ہیں۔ اس لیے اسلامی بنیاد پرستوں کا بھوت مغربی طاقتوں کی طرح بھارت کے سر پر بھی سوار ہے۔

ہمیں اپنی مختصر عمر میں بھی یہ سبق ملا ہے کہ بڑی طاقتیں ہمیشہ بڑی نہیں رہتیں۔ حالات کا اتار چڑھاؤ بڑوں کو چھوٹا اور چھوٹوں کو بڑا بنا دیتا ہے۔ ہماری زندگی کے اندر سورج غروب نہ ہونے والا برطانیہ ایک چھوٹی طاقت بنا اور پھر سب سے بڑی فوجی طاقت روس داخلی انتشار کا شکار اور اقتصادی طور پر بھی تباہ و برباد ہوا۔ وہ یورپی ممالک جو ہمیشہ سے آپس میں برسر پیکار رہے ہیں اور پھر ان کی سیاسی رقابتوں کے باعث دنیا پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا شکار ہوئی، یہ ممالک آج کل ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں اور یورپی یونین کا قالب اختیار کر رہے ہیں۔

کوئی بعید نہیں کہ اسلام کے عالمگیر نظریے اور متحرک تعلیمات سے سرشار اسلامی تحریکوں کی راہنمائی میں عالم اسلام کا موجودہ انتشار مستقبل قریب میں کسی باہمی مفاہمت کی تحریک میں تبدیل ہو جائے اور اس وقت جو برائے نام او آئی سی موجود ہے وہ مستقبل میں چل کر اقتصادی، دفاعی اور سیاسی تعاون کے ایک بلاک میں ڈھل جائے کہ جس میں پاکستان، افغانستان، ایران، ترکی، وسطی ایشیا کی چھ ریاستوں پر مشتمل ایکو (ECO) طرز کا بلاک بن جائے جو مسلمانوں کی مشترک تہذیبی اور سیاسی یکجہتی کا اظہار ہو۔ بھارتی اور مغربی لابی کی پوری کوشش ہے کہ وہ ان سارے امکانات کو دیوانے کی بڑ قرار دے دیں اور اسلامی تحریکوں کو اس کی طرف بڑھنے اور اس کا خواب دیکھنے کے بجائے غلامی کا خوگر بنا دیں اور حقیقت پسندی کے نام سے بھارت، امریکہ اور یورپین اقوام کی بالادستی کا سبق پڑھائیں۔

جو لوگ کشمیر کے جہاد ہونے میں شک کر رہے ہیں ان کے دلائل بہت بودے اور

کمزور ہیں۔ کشمیر کی حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک آبادی کو بالکل ناجائز تشدد اور فراڈ کے ذریعے بھارت نے زبردستی اپنے فوجی تسلط میں رکھا ہوا ہے۔ مسلمان اس تسلط کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔ قرآنی نص کی رو سے تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ان مظلوم اور مقہور مسلمانوں کی مدد کو پہنچیں۔ یہی کام جماعت اسلامی کر رہی ہے اور یہی کام اسلامی تحریکیں کر رہی ہیں۔ کشمیر کا جہاد ہر لحاظ سے اسلامی جہاد ہے اور جو بھی کسی طریقے سے ان کی مدد کر سکتا ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ کی تعریف میں آتا ہے۔ کچھ لوگ اس میں قیمتی جانوں اور اسلام کے جذبہ سے سرشار نوجوانوں کی قربانی کو ضائع قرار دے رہے ہیں؛ حالانکہ جہاد کی کھیتی ایسی ہے کہ جو کٹنے سے بڑھتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے واقعے میں ایک تمثیل کے ذریعے یہ بات بتائی گئی۔

کچھ لوگ جہاد میں ناکامی کے اندیشے کھڑے کر کے بھارت کے شرائط تسلیم کرنے کو دانشمندی اور عملیت پسندی کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ کشمیر کی موجودہ صورتحال میں سب کو نظر آ رہا ہے کہ بھارت وہاں زیادہ دیر اپنا تسلط نہیں رکھ سکتا۔ گزشتہ ۱۲،۱۰ سال میں بھارت کو وہاں کافی زک پہنچی ہے۔ اگر عالم اسلام کے حکمران مسلمانوں کی عزت و آزادی کے لیے اقدامات کریں، اگر پاکستان کی حکومت جہاد کا کھلا ساتھ دے، امریکی عزائم کی خاطر قدم پیچھے نہ ہٹائے، تو یہ جہاد مختصر ہو سکتا ہے۔ مجاہدین کی فتح تو نوشتہ دیوار ہے اور نظر آتی ہے۔ جو لوگ بھارت کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بات کرتے ہیں ان کی مانی جائے تو کہیں سے بھی ظلم کا راج کبھی ختم نہ ہو۔

موجودہ عالمی تناظر میں تحریک اسلامی کے لیے حکمت عملی طے کرتے وقت غیر ضروری رد و کد سے بچنا چاہیے۔ آج کی ضرورت یہ ہے اور یہ انسانیت کا اُمت مسلمہ پر حق ہے کہ اسلام کو ایک عالمگیر نظریے اور انسانیت کے لیے مکمل فلاح کے نظام کے طور پر پیش کیا

جائے۔ اسلام کے حوالے سے مخالفین عدم برداشت، تشدد اور دہشت گردی کا جو پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اس کے توڑ کے ساتھ ساتھ اسلام کی حقانیت پر کامل یقین رکھا جائے اور نوجوان نسل کو اس یقین سے سرشار کیا جائے کہ دنیا کا مستقبل امریکہ کے ہاتھ میں نہیں، اللہ رب العالمین کے ہاتھ میں ہے۔ حکمت، دانائی اور ایمان کامل کے ساتھ اگر اللہ کے بھروسے پر آگے بڑھیں گے تو عالم اسلام ہر لحاظ سے ایک بڑی قوت ہے جس کے پاس افرادی اور مادی وسائل ہیں، جس کے پاس دنیا کا متصل بڑا رقبہ ہے جو جغرافیائی لحاظ سے دنیا کا وسطی علاقہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پاس دنیا کا متصل بڑا رقبہ ہے جو جغرافیائی لحاظ سے دنیا کا وسطی علاقہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پاس ایک ایسا دین ہے جو فرد کو اپنی ذات سے اٹھا کر قربانی کے لیے آمادہ کرتا ہے اور رنگ و نسل کے تعصبات سے بالاتر کر دیتا ہے۔ ہمیں ہر طرح کے تعصب اور وہن (خوف) کے احساس سے آزاد ہو کر اور ایمان کامل سے مشرف ہو کر اپنی حکمت عملی طے کرنی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بے وقت ہر طاقت سے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کریں۔ ہمارے پیش نظر رضائے الہی کے بعد عوام کی مصلحت ہونی چاہیے اور پھر اس کے بعد اس فریم ورک میں رہتے ہوئے دنیا کی طاقتوں سے برابری کی بنیاد پر روابط اور تعلقات بھی رکھنا چاہئیں لیکن اگر امریکہ، یورپ اور بھارت کو راضی کرنے کے لیے اپنے رب کو ناراض کر دیں اور اپنے مفادات چھوڑ کر ان کے مفادات کے لیے کام شروع کر دیں تو اس سے اللہ بھی ناراض ہوگا اور یہ طاقتیں بھی راضی نہیں ہو سکیں گی۔



## ہدایات

ہمارے نظامِ جماعت میں ارکان کا کل پاکستان اجتماع بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ارکانِ جماعت ہی ہماری جماعت کا مرکز و محور اور اصل طاقت ہیں۔ یہ ہماری پوری افرادی قوت کا مرکزی دائرہ ہے۔ اس کے گرد دوسرا دائرہ کار کنانِ جماعت اور متفقیین اور ممبران کا ہے اور تیسرا دائرہ عامۃ المسلمین کا ہے جن کی تائید حاصل کر کے ہم اپنے ملک میں اور پوری دنیا میں اقامتِ دین کی جدوجہد کے ذریعے بنیادی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں تاکہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں، اللہ کے بندوں کی حیثیت سے اپنا فرض منصبی ادا کریں اور بالآخر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

ارکانِ جماعت کا یہ مرکزی دائرہ اور محور جتنا مضبوط ہوگا، جماعت اتنی ہی مضبوط ہوگی اور اس میں دوسرے اور تیسرے دائرے کے لوگوں کو لے کر چلنے کی صلاحیت اسی نسبت سے زیادہ ہوگی۔ بلاشبہ ارکانِ ہمارے اس نظام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اللہ کا پیغام تمام انسانوں کے لیے ایک ہی ہے یعنی یہ کہ سچے دل سے اللہ کے بندے بن جاؤ اور جو مشن اللہ نے تمہارے سپرد کیا ہے اس میں سرگرم عمل ہو کر اللہ کے اعوان و انصار بن جاؤ۔ اس مشن کو انجام دینا ارکان کی اولین ذمہ داری ہے تاکہ وہ دوسروں کے لیے نمونے اور کشش کا باعث ہوں۔

اس عظیم کام اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے اور ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے

اصل مقصد طریق کار اور اس کے مطالبات کی تذکیر اور یاد دہانی بار بار کریں۔ قرآن کا اسلوب اور حضور اکرمؐ کا یہی طریقہ رہا ہے۔ جن بنیادی باتوں کی یاد دہانی میں کرار ہا ہوں وہ آپ میں سے کسی کے لیے نئی نہیں ہیں لیکن یہی وہ باتیں ہیں جن کا اعادہ اور تکرار ہمیشہ ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر وقت ہمارے سامنے ہوں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم ہر وقت اپنے آپ سے یہ سوال کرتے رہیں کہ میں جماعت اسلامی میں کیوں ہوں؟ میرے سامنے اصل مقصد کیا ہے؟ اس سوال کا واضح اور دو ٹوک جواب یہ ہونا چاہیے کہ میں اس لیے جماعت اسلامی میں ہوں کہ میں اپنے اللہ کو راضی کر سکوں، میرے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے۔ رب کی رضا کے لیے اعلائے کلمۃ اللہ، اقامت دین اور اللہ کی طرف دعوت دینا ہر مسلمان اور رسول اللہ کے ہر امتی کا فرض ہے۔ صرف انفرادی طور پر اس کام کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ یہ کام اجتماعی جدوجہد کا متقاضی ہے۔ جماعت اسلامی اس مقصد کے لیے منظم جدوجہد کر رہی ہے اور میں اس منظم جدوجہد میں بطور رکن جماعت شریک ہو کر اس مقصد کو بخوبی حاصل کر سکتا ہوں۔ جب تک ہم اس مقصد کے لیے مخلصانہ جدوجہد کرتے رہیں گے اور یہ ہر وقت ہمارے پیش نظر رہے گا اس وقت تک ان شاء اللہ ہماری اجتماعی سمت بھی درست رہے گی اور یہ ہر وقت ہمارے پیش نظر رہے گا اس وقت تک ان شاء اللہ ہماری اجتماعی سمت بھی درست رہے گی اور ہم میں سے ہر فرد کی سمت بھی درست رہے گی اس کے ساتھ ساتھ رکنیت کی بنیادی شرائط بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہئیں۔

## عہد وفا، وفائے عہد

علم، پہلی ضرورت:

اسلام کا علم ہماری پہلی ضرورت ہے۔ علم ایک جامد چیز نہیں ہے۔ علم مسلمان ہونے

کے لیے بھی شرط ہے اور علم ہی انسان کا امتیاز ہے (عَلَّمَ اَدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا) علم کے بغیر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی، حلال و حرام کی تمیز نہیں ہو سکتی اور حق اور باطل کے درمیان فرق کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ حضور نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ  
 ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد اور عورت) پر فرض ہے۔“  
 اور فرمایا:

اَطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ إِلَى اللَّحْدِ  
 پتنگھوڑے سے لے کر لحد تک علم حاصل کرتے رہو۔ یعنی پوری زندگی طلبِ علم میں گزارنے کا حکم ہے۔ رکن بننے کے لیے اتنا علم تو لازمی ہے کہ اسلام اور غیر اسلام کا فرق معلوم ہو جائے لیکن کم پر اکتفا کرنا رکنِ جماعت کے شایانِ شان نہیں ہے۔ جس نے اپنی پوری زندگی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے وقف کرنے کا حلف اٹھایا اس کی ذمہ داری ہے کہ ہر لمحے اپنے علم میں اضافے کے لیے کوشاں رہے۔

### قرآن سے تعلق:

ہمارے ارکانِ جماعت کا فرض ہے کہ قرآنِ کریم کے ساتھ خصوصی تعلق رکھیں۔ اس کی تلاوت اور اسے سمجھ کر پڑھنا، تفسیر کا مطالعہ اور ہر وقت قرآن ساتھ رکھنا، جماعت کے ارکان کی صفت اور شناخت ہونی چاہیے۔ ہمارے بعض ارکان قرآنِ کریم کو صحیح تلفظ اور تجوید کے ساتھ ناظرہ پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ یہ امر ارکانِ جماعت کے لیے افسوسناک ہے۔ ہمارے تمام ساتھیوں کا فرض ہے کہ عمر کے جس حصے میں بھی ہوں، قرآنِ کریم کو صحیح تجوید کے ساتھ پڑھنے کی صلاحیت کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے معنی و مفہوم اور پیغام و احکام کو سمجھیں اور قرآن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں۔



میں آپ سے یقین سے کہتا ہوں کہ جتنا قرآن آپ کی روح میں جذب ہوگا اتنے ہی آپ اچھے انسان اور متحرک کارکن بن جائیں گے۔ اس طرح خود اپنے لٹریچر اور تمام دستیاب اسلامی لٹریچر کا بار بار مطالعہ ایمان کو تازہ رکھنے، فکر کو بیدار کرنے اور کارزارِ حیات میں مقابل قوتوں پر علمی تفوق حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

### اللہ کا قرب:

فرائض کی ادائیگی اور کبیرہ گناہوں سے اجتناب رکنیت کی اولین شرائط میں سے ہے۔ یہ تو وہ کم سے کم معیار ہے جس کا اسلامی شریعت ہم سے مطالبہ کرتی ہے۔ کم پر قانع ہو جانا عباد الرحمن کا شیوہ نہیں، اس کا شیوہ اور ان کی کوشش تو رب کے قرب کا حصول اور صبتہ اللہ میں رنگ جانے کی ہوتی ہے۔ فرائض کی حیثیت تو اس دروازے کی سی ہے جس سے ہم اس نعمت کدے میں داخل ہوتے ہیں۔ تاہم اللہ کے قرب اور اسلام کی چاشنی سے روشناس ہونے کے لیے عبادت میں احسان کی کیفیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ خاص طور پر ان کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ ان کو تو سمجھنا چاہیے کہ ان کی قوت کا راز اور دعوت کی راہ میں ان کا سب سے قیمتی اسلحہ یہی احسان کی کیفیت ہے۔ احسان کی کیفیت کی تشریح کرتے ہوئے رسول اللہ نے فرمایا ہے:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ

کہ تو اپنے رب کی ایسی عبادت کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے لیکن اگر یہ کیفیت نہ پیدا ہو سکے تو اتنی تو ضرور ہونی چاہیے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

نماز باجماعت کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے۔ یہ عام مسلمانوں کے ساتھ اور دیندار مسلمانوں کے ساتھ رابطے کا بھی ذریعہ ہے اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں دلچسپی کی علامت بھی ہے۔

## حلقہ احباب کا قیام:

آپ جس مسجد میں نماز پڑھیں اس مسجد کے تمام نمازیوں کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلقات ہونے چاہئیں۔ اس کے لیے ہمارے مرحوم بھائی خرم مراد صاحب نے ”حلقہ احباب“ کے نام سے ایک طریقہ رائج کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ طریقہ جماعت میں پوری طرح سے رائج نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ ارکان جماعت کے تساہل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ جماعت کے ارکان فجر کی نماز باقاعدگی سے اپنے محلے کی مسجد میں ادا کریں۔ مسجد کے تمام نمازیوں کے ساتھ بتدریج ذاتی روابط قائم کریں، چاہے ان کا تعلق کسی بھی سیاسی جماعت یا مذہبی مکتب فکر سے ہو۔ اس پورے گروہ کو اپنا حلقہ احباب بنالیں اور ان کے گھروں میں بیمار پرسی، شادی اور غمی کے مواقع پر اور دوستانہ تبادلہ خیال کے لیے آنا جانا اپنا معمول بنالیں۔ اس طرح آنے جانے سے محلے بھر میں ایک حلقہ احباب تشکیل پا جائے گا جو دعوت الی الخیر کے لیے انتہائی مفید میدان ثابت ہوگا اور کسی مزاحمت کے بغیر آپ کو اللہ کے دین کے راستے میں مفید ساتھی مل جائیں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب لوگ جماعت اسلامی میں شامل ہوں لیکن اچھے ذاتی روابط کے نتیجے میں مشترک مقاصد کے لیے آپ ان سب کا تعاون حاصل کر سکیں گے۔

## اجتماع اہل خانہ:

ہمارا ایک اور اہم پروگرام اجتماع اہل خانہ ہے۔ یہ بیوی بچوں کی تربیت کی خاطر بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اگر ہفتہ میں کم از کم ایک بار بھی اہل خانہ ایک دعوتی اجتماع کے لیے ایک آدھ گھنٹے کے لیے مل بیٹھیں تو پورے خاندان کی فضا پر بہت مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت جماعت اسلامی میں پورے پورے خاندان مرد عورتیں، نوجوان، بچے، بچیاں سب شریک ہیں۔ سب کی اپنی الگ الگ تنظیمیں بھی بنی ہوئی

ہیں۔ اگر گھر میں بھی دعوتِ دین کا ماحول پیدا ہو جائے تو یہ ایک مسلم گھرانہ قائم کرنے کے لیے بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنی انفرادی تربیت اور مطالعہ قرآن و حدیث کے بعد اپنے خاندان کی تعلیم و تربیت ہمارا سب سے اولین کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح الفاظ میں ہمیں اس کی فکر کرنے کا حکم دیا ہے کہ اپنے کو اور اپنے اہل خانہ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ (قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا) دعوت کی حکمتِ عملی کے اعتبار سے خاندان کی اصلاح خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ درست ہو جائے تو پوری دیوار سیدھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور یہ کمزور یا ٹیڑھی رہے تو تاثیرِ می رود دیوار کج۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کام کی تدریج یہ ہے کہ مسلم فرد کی تربیت ہو، مسلم گھرانے کی تعمیر ہو، مسلم معاشرے کی تعمیر ہو اور مسلم حکومت کے ذریعے سے ان سب کو قوت عطا ہو اور انسانی تہذیب و تمدن خیر و صلاح کا گہوارہ بن جائے۔

### اہل خانہ سے حسن سلوک:

اپنے گھر کو ایک اچھے مسلم گھرانے کا نمونہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کا سلوک اپنے اہل خانہ کے ساتھ محبت، شفقت اور بے تکلفی کا ہو۔ حضور نبی کریم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے لیے اچھا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جس طرح عورتوں کو مردوں سے کم تر سمجھا جاتا ہے، لڑکے کو لڑکی پر فوقیت دی جاتی ہے، لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو کم اہمیت دی جاتی ہے، اس کا اسلامی تصور سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ عورت اور مرد حقوق میں برابر ہیں۔ اگرچہ ذمہ داریوں میں دونوں کے درمیان فرق ہے۔ اگر ایک طرف خواتین کو مغربی تہذیب کی یلغار سے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے تو دوسری طرف یہ بھی ہمارا فرض اولین ہے کہ ہمارے رواجی معاشرے میں عورت کو جس طرح تعلیم، وراثت اور دوسرے حقوق سے محروم رکھا گیا ہے، ہم اس بے انصافی کے خلاف بھی آواز بلند کریں۔



معاشرے میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حقوق نسواں کے بارے میں شعور اور آگہی پیدا کریں اور جس طرح رواجی پابندیوں کو عین اسلام قرار دیا جاتا ہے، خود اس روش کا شکار ہونے کی بجائے عورت کو پاکستانی معاشرے میں وہی ممتاز اور باعزت مقام دلوانے کی جدوجہد کریں جو ایک خالص اسلامی معاشرے کا طرہ امتیاز ہے۔ اس مقصد کے لیے ارکان اور کارکنان جماعت کو اپنے گھر میں عورتوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے حقوق کا زیادہ لحاظ کرنا چاہیے اور گھر میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیے کہ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی مکمل طور پر اہم مشوروں میں شامل ہوں۔

### ہفتہ وار اجتماع کارکنان:

نظام جماعت میں تربیت کارکنان کا ابتدائی اور موثر ہفتہ وار اجتماع کارکنان ہے۔ اس اجتماع کو موثر بنانے کے لیے اور کارکنان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تنوع ہو۔ یہ ایک زندہ اور بیدار اجتماع ہو۔ اس کے لیے تیاری کریں۔ محنت کر کے اپنے ساتھیوں کو فکری اور روحانی غذا فراہم کریں۔ ہر اجتماع کے بعد وہ محسوس کریں کہ وہ اس سے کچھ لے کر اٹھ رہے ہیں۔ محض نشندہ و گفتندہ بر خاستند کی کیفیت نہ ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ناظم اور دوسرے ذمہ دار ہر اجتماع کو مفید بنانے کے لیے شعوری کوشش کریں اور محض رواروی میں یہ کام انجام نہ دیا جائے۔ اس اجتماع میں کارکنان کو ہفتہ بھر کے لیے انفرادی اور اجتماعی کام دیا جائے، ہفتہ وار کردگی کا جائزہ لیا جائے، ارد گرد کے ماحول میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کا جائزہ لیا جائے، گھر گھر دعوت پہنچانے کے لیے منصوبہ بندی کی جائے اور ہر کارکن کے ذمے متعین کام لگا دیا جائے۔ ایک عام ممبر یا متفق کارکن بنانے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے ذمے متعین کام لگا کر اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو جماعت اسلامی کا ذمہ دار کارکن سمجھنے لگتا ہے۔

## دُعوتِ الی اللہ:

ہمارا اصل کام اللہ کی طرف بلانا ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي  
وَسُبْحَنَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (یوسف ۱۰۸)

”آپ کہہ دیجیے (اے نبی) میرا راستہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔  
میں اور میرے ساتھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہے ہیں اور اللہ پاک ہے  
اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔“

چنانچہ اس ملک کے ایک ایک فرد تک پہنچنا اور انھیں اللہ کی طرف بلانے کا حق ادا کرنا  
ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر ہم اپنی برادر تنظیموں کے کارکنوں کے ساتھ مل کر ایک منصوبے  
کے تحت پورے شوق سے اس کام کو کرنے کا تہیہ کر لیں تو اللہ کے فضل سے اب ہماری تعداد  
اتنی ہے کہ ہم ایک دو سال میں ہر گھر اور ہر فرد تک پہنچ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری  
ہے کہ ہم کولہو کے نیل کی طرح ایک محدود دائرے کے اندر ہی گردش نہ کرتے رہیں بلکہ اپنے  
خول سے باہر نکل کر ہر ایک کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ کا حکم تو آپ  
کے لیے یہ ہے کہ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور ہمارا عالم یہ ہے کہ ہم اپنے ہی  
حلقے میں سارا وقت گزار کر خوش ہو لیتے ہیں کہ بہت کام کر لیا۔ اصل کام تو اپنے حلقے سے  
باہر نکلنا، دوسروں تک پہنچنا، ان کی سنا اور ان کو اپنی بات سنانا اور انھیں اپنی دعوت میں  
جذب کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ بلاشبہ موثر انفرادی رابطہ ابلاغ کا سب سے کامیاب ذریعہ  
ہے۔ اس کے لیے آپ متنوع طریقے اختیار کر سکتے ہیں:

☆ براہِ راست دعوت کے لیے کسی کے ساتھ ملاقات کرنے کے لیے اس کے دفتر یا

گھر جانا۔

☆ بچے یا بچی کی تعلیم کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے لیے ملاقات کرنا۔ اگر آپ بیٹھک اسکول یا مسجد مکتب قائم کر لیں تو یہ بچوں کے علاوہ ان کے سرپرستوں تک دعوت پہنچانے کا موثر ذریعہ بن سکتا ہے۔

☆ بیمار پرسی، مزاج پرسی، تعزیت، مبارکباد وغیرہ کے لیے جانا۔

☆ خدمت کا کام منظم کر کے، بیماروں کے علاج میں مدد اور رہنمائی، گیس، بجلی کا بل ادا کرنے کی خدمت کی پیشکش، پولیس اسٹیشن اور سرکاری دفاتر میں مدد۔ اس کے لیے آپ مختلف اداروں میں موجود جماعت کے ہم خیال لوگوں سے رابطہ پیدا کریں۔

☆ عام طور پر لوگوں کو ظلم اور غنڈہ گردی کے مقابلے میں تحفظ فراہم کرنا۔ اس کے لیے نوجوان کارکنوں کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام شباب ملی، اسلامی جمعیت طلبہ، جمعیت طلبہ عربیہ اور حزب المجاہدین سے مل کر کیا جاسکتا ہے۔ یہ معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہے اور اگر جماعت اسلامی کے ارکان اور کارکنان توجہ دیں تو سارا کام اس وقت تھوڑی سی کوشش اور توجہ کے نتیجے میں منظم ہو سکتا ہے۔

### مسجد مکتب اسکیم:

مسجد مکتب کے قیام کا ایک چھوٹا سا تجربہ ہمارے چند کارکنوں نے خود منصورہ کے آس پاس کی کچی آبادیوں میں کیا۔ جب مسجد مکتب کے اساتذہ کی پہلی تربیت گاہ شروع ہوئی تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مسجد مکتب کے قیام کا عملی تجربہ کیا جائے۔ چند کارکنوں کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ آس پاس کی بستیوں میں دیکھیں جو بچے بچیاں تعلیم کی نعمت سے محروم ہیں، گلی کوچوں میں آوارہ بھٹک رہے ہیں، شفقت سے محروم ہیں، غربت اور ناداری کی وجہ



سے یا معاشرے کی عدم توجہی کے باعث یونہی خاکہ میں رُل رہے ہیں ان کو تلاش کریں اور ان کے والدین سے درخواست کریں کہ ایک دو گھنٹے کے لیے بچے یا بچی کو منصورہ کی جامع مسجد میں بھیج دیں۔ اس طرح سے دو چار روز میں ۶۰/۷۰ بچے بچیاں جمع ہو گئیں۔ ان بچوں کو پیار محبت سے دو چار دنوں میں بسم اللہ کلمہ طیبہ سلام وضو اور نماز وغیرہ سکھایا گیا اور جب چند روز بعد کارکنان ان کے گھروں میں گئے تو چند بچوں کی مائیں فرط جذبات سے رو پڑیں کہ ان کے بچوں کو پیار محبت ملا ہے اور اب ان کے دل مسجد کے ساتھ اُٹکے ہوئے ہیں۔ چند روز کے اندر ہم نے یہ تبدیلی بھی دیکھی کہ بچوں کی طرف ان کی مائیں بھی توجہ دینے لگی ہیں۔ انھیں نہلا دھلا کر مسجد میں بھیجتی ہیں۔ ان کے کپڑے اُچلے ہوتے ہیں اور ان کے اندر صفائی اور نظافت کی حس بیدار ہو گئی ہے۔ معاشرے کے غریب اور پسماندہ طبقات کی خدمت کرنے اور ان تک رسائی حاصل کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ ارکان و کارکنان سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنے ماحول میں اس طرح کے ایک مسجد مکتب کی بنیاد ڈال دیں۔ اس پر خرچ کچھ بھی نہیں آتا۔ اگر آپ بچوں کو قرآن کریم پڑھانے، لکھنا پڑھنا سکھانے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آداب شہریت سکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور مقامی مسجد کی کمیٹی اور امام و خطیب کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں تو معاشرے کی اس سے زیادہ بہتر خدمت کوئی نہیں ہے کہ آپ غریب اور بے سہارا بچوں کو محبت اور شفقت کے ساتھ علم کی روشنی سے فیضیاب کر دیں۔ اس طرح آپ غریب کی کثیا کو علم کی شمع سے منور کر سکتے ہیں۔

### بیٹھک اسکول:

اسی نوعیت کا کام ہماری خواتین بیٹھک اسکول کے ذریعے کر رہی ہیں۔ کراچی اور لاہور کی پسماندہ آبادیوں میں کئی ہزار بچے اور بچیاں ان اسکولوں سے استفادہ کر رہے

ہیں۔ ابتدائی تعلیم کا نصاب اس طرح کروایا جا رہا ہے کہ دین کا فہم اور شہری شعور بھی پیدا ہو۔ اس ذریعے ان بچوں کے خاندانوں میں دعوت کے راستے کھلے ہیں۔ ہماری خواتین نے اپنی گھریلو اور دیگر مصروفیات کے باوجود اس کام کو بڑی توجہ اور محنت سے منظم کیا ہے۔ یقیناً اللہ ہی انھیں اجر دینے والا ہے۔ یہ اُن بچوں کی تعلیم دینے اور پاکستان کا باوقار شہری بنانے کا کام ہے جن کے والدین فیس ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اگر معاشرے کے با وسائل افراد اپنے اپنے محلوں میں خواتین کے ساتھ تعاون کریں تو اس کام میں وسعت کی بڑی گنجائش ہے۔

ہمارا مقصود رضائے الہی:

خدمتِ خلق اور رابطہ عوام کا یہ سارا کام کرتے وقت ایک لمحے کے لیے بھی یہ امر ذہن سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارا مقصد حقیقی اللہ کی رضا ہے۔ یہ مقصد حقیقی ہر وقت مستحضر ہوگا تو پوری زندگی سراسر عبادت بن جائے گی۔ ساری بھاگ دوڑ اللہ کے راستے میں شمار ہوگی اور فلاحِ اخروی کا موجب بنے گی۔ خدا نخواستہ اگر یہ مقصد حقیقی نظر سے اوجھل ہو جائے یا بالکل ہی پس منظر میں چلا جائے تو یہ بھاگ دوڑ منفی اثرات مرتب کرے گی۔ جماعت کے بارے میں جو لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ اس پر سیاست غالب آگئی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایسے کارکنوں کو دیکھتے ہیں کہ جلسہ، جلوس، تھانہ کچہری، احتجاج اور ہنگاموں میں تو بڑی تیزی دکھاتے ہیں لیکن نماز، ذکر، تلاوتِ قرآن میں وہ شوق اور جذبہ نظر نہیں آتا جو اللہ والوں میں نظر آنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تمام اعمال کا مقصد حقیقی واقعاً اللہ کی رضا ہو اور یہ مقصد ہر وقت مستحضر بھی ہو تو ساری سیاسی جدوجہد اور خدمتِ خلق کی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں اللہ کے ساتھ تعلق مزید مضبوط ہوتا ہے اور شخصیت پر وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو نماز، روزے اور ذکر کے نتیجے میں ہوتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی

۲۰۳ — مضامین قاضی حسین احمد

تجربہ ہے کہ اگر توجہ اللہ کی طرف ہو اور نیت خالص ہو تو بڑے بڑے سیاسی معرکے اللہ کے قرب اور دل کی نرمی اور گداز کا ذریعہ بنتے ہیں۔ نمازوں میں زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے اور دل ہر وقت شکر و سپاس اور اللہ کی کبریائی کے اثرات کے تحت مطمئن رہتا ہے۔ زندگی کو سیاسی اور غیر سیاسی یا دینی میں تقسیم کرنا دین اسلام کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ البتہ دنیا کے امور کو سرانجام دیتے وقت اللہ کے ذکر سے غافل ہو جانا انسان کو بھٹکا دیتا ہے۔ اس لیے مسنون دعا ہر وقت کرتے رہنا چاہیے:

فَلَا تَكِلُنَا إِلَى أَنْفُسِنَا طَرْفَةَ عَيْنٍ وَأَصْلِحْ لَنَا شَأْنَنَا كُلَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ  
”اے ہمارے رب ہمیں آنکھ کی جھپک کے مانند بھی اپنے نفس کے حوالے نہ  
کیجیے اور ہمارے تمام کاموں کی اصلاح کیجیے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔“

باہمی تعلقات:

مل جل کر دین کا کام کرنے کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَهُمْ بُنْيَانٌ  
مَرُصُوصٌ (الصف ۶۱: ۴)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر  
جنگ لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہیں۔ جو لوگ خالصتاً اللہ کی خاطر  
آپس میں محبت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو جوڑ دیتا ہے۔

لَوْ أَنْفَقْتُ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا آَلَفْتُ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ  
آلَفَ بَيْنَهُمْ (الانفال ۸: ۶۳)

”اگر زمین کی ساری دولت آپ خرچ کر دیتے تب بھی آپ ان کے دلوں کو



آپس میں نہیں جوڑ سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا ہے۔“

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

آپس میں محبت بڑھانے کے لیے قرآن کریم کا حکم ہے کہ سلام کا جواب بہتر انداز میں دیا جائے۔ یعنی اگر کوئی کہے کہ السلام علیکم تو آپ کہیں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ اگر کوئی کہے کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ تو آپ کہیں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اسی طرح بہتر جواب دینے کا انداز یہ ہے کہ زیادہ گرم جوشی اور زیادہ خندہ پیشانی سے جواب دے کر استقبال کیا جائے۔ اگر چہرے کے اوپر ملال اور بے اعتنائی کی کیفیت ہو یا جواب بالکل ہی زیر لب دیا جائے تو یہ محبت بڑھانے کے بجائے ناراضی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ قرآن کریم کا حکم ہے:

وَإِذَا حُيِّتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا (النساء: ۸۶)

”اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر جواب دو یا کم از کم اتنا تو ضرور دو۔“

اجتماعی زندگی کے آداب میں ایک دوسرے کا احترام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بات صرف سلام تک محدود نہیں، یہ تو انسانی تعلقات کے آغاز اور ہماری تربیت کے لیے ہے ہمارے تو تمام معاملات اس اصول پر مرتب ہونے چاہئیں کہ خوب سے خوب تر کی طرف پیش قدمی ہمارا طریقہ ہو۔ برائی کو بھی بھلائی سے بدلیں (ادْفَعُ بِالْأَيْمَنِ هِيَ أَحْسَنُ) اور حسن کے جواب میں احسن اور مزید بہتر راستہ اختیار کریں، پھر دیکھئے راستے کس طرح کھلتے ہیں اور قرآن کی یہ بشارت پوری ہوتی ہے کہ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (حم السجدہ ۴۱: ۳۴)

”تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کو عداوت پڑی ہوئی تھی وہ تمہارا جگری

دوست بن گیا ہے۔“

بعض ساتھی زیادہ بے تکلفی میں ایک دوسرے کے احترام کے ظاہری مظاہر کو ترک کر دیتے ہیں یا درشت اور سخت رویے کو بے تکلفی کا مظہر سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح کا طرزِ عمل بالآخر تعلقات میں سرد مہری اور تلخی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ بے تکلفی کے ساتھ ساتھ آدابِ مجلس کا لحاظ رکھنا، خندہ پیشانی سے ملنا، محبت کا اظہار کرنا، مصافحہ کرنا اور اگر زیادہ طویل مدت کے بعد بے تکلف دوست مل جائے تو معانقہ کرنا محبت بڑھانے کا سبب بنتے ہیں۔ چھوٹے موٹے تحائف اور ہدایا کا تبادلہ بھی اس کا ایک ذریعہ ہے۔ ایک دوسرے کا استقبال کرنا، بڑھ کر خوش آمدید کہنا، دوسرے کو کرسی بھی پیش کرنا، پھول کا تحفہ پیش کرنا، ٹیک لگانے کے لیے تکیہ دینا اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے اندازِ محبت، انکساری اور ملنساری کی علامتیں ہیں۔ خود بھی ان کو اپنانا چاہیے اور بچوں کو بھی سکھانا چاہیے۔

ستر پوشی مومن کی صفات میں سے ایک اہم صفت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے اپنے بھائی کے ستر کو چھپایا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے ستر کو چھپائے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ کو اپنے بھائی کا ایک عیب نظر آ گیا، آپ پر اس کی کوئی کمزوری ظاہر ہو گئی تو آپ اس کا اعلان کرنے اور لوگوں کو اس سے باخبر کرنے کی بجائے اسے چھپا دیں تو یہ اللہ کے ہاں اجر کا باعث ہوگا۔

اسی طرح تجسس اور غیبت سے منع کیا گیا ہے۔ غیبت یہ ہے کہ آپ کے بھائی میں کوئی عیب موجود ہے اور آپ اس کی غیر موجودگی میں دوسروں کے سامنے اس کا ذکر کریں۔ اگر وہ عیب سرے سے موجود ہی نہیں ہے تو یہ بہتان ہے جو زیادہ سنگین جرم ہے۔

ان احکام کی روشنی میں جب آپ احتساب کی جماعتی روایت دیکھیں گے تو اس کی حدود آپ کی سمجھ میں خود بخود آ جائیں گی۔ اسی لیے مسلمان کو مسلمان کا آئینہ کہا گیا ہے کہ

آئینہ صرف اپنے سامنے والے کو بتاتا ہے کہ وہ کیسا ہے اس میں کیا خوبی اور کیا نقص ہے اور بڑھا چڑھا کر بتانے کی بجائے اتنا ہی بتاتا ہے جتنا کہ حقیقت ہے۔ اس کی تشہیر بھی نہیں کرتا۔ غیبت نہیں کرتا بلکہ خاموشی سے بتا دیتا ہے۔

احساب وہی مفید ہے جس کے پیچھے محبت کا جذبہ کارفرما ہو۔ اگر اس کے پیچھے حسد، بغض یا چغلی اور بدخواہی ہوگی تو وہ جماعت کے لیے مضر اور باہمی تعلقات کو خراب کرنے کا موجب ہوگا۔ ایسے احساب سے گریز کرنا چاہیے جو جماعت میں محبت کی بجائے بددلی پیدا کرنے کا سبب بنے۔

## موثر تنظیم کے تقاضے

### خوئے دل نوازی:

باہمی اچھے تعلقات اور محبت کے ساتھ ساتھ عوام الناس سے بھی محبت کا برتاؤ دعوت کو عام کرنے کے لیے بنیادی وسیلہ ہے۔ مومن کی نشانیوں میں ایک نشانی حضور نبی کریمؐ نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ خندہ رو ہوتا ہے اور کھلی پیشانی سے ملتا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا:

تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ (ترمذی)

”تیرے بھائی کے لیے تیرا مسکراتا ہوا چہرہ صدقہ ہے۔“

ایک مسجد میں عام اجتماع کے موقع پر جب جماعت کے ایک بزرگ ساتھی نے میری موجودگی میں جماعت کے کارکنوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی یہ خصلت اللہ کو بہت پسند ہے کہ آپ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو اجتماع میں موجود ایک عام آدمی نے اُٹھ کر مجمع کے ساتھ مجھ سے کہا کہ قاضی صاحب! اپنے ساتھیوں سے کہہ دیں کہ آپس میں محبت کے علاوہ عام مسلمانوں سے بھی محبت کیا کریں۔ میں نے نکتہ اُٹھانے والے اس شخص سے اتفاق کیا۔ کارکنان جماعت سے میری یہی استدعا ہے کہ عام لوگوں



کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا سلوک کریں۔ قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے:

قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ ۲: ۸۳)

”لوگوں سے اچھی بات کرو۔“

قول حسن وہی گفتگو اور بات ہے جو سچی بھی ہو، پیاری بھی ہو اور خندہ پیشانی سے کی جائے، جس سے دوسرے کے دل میں خوشی کے احساسات پیدا ہوں۔ یہ حکم عام ہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہر انسان سے ہمارا یہ بلند اخلاق کے شایان شان ہو۔ حضور نبی کریم کو اللہ نے فرمایا:

اِنَّكَ لَعَلٰی خُلِقَ عَظِيْمٌ (القلم ۲۸: ۴)

”اور (اے نبی) آپ بلاشبہ اخلاق کے بلند ترین مقام پر ہیں۔“

حضور نبی کریم کے اُمتیوں میں بھی ان کے بلند اخلاق کا پرتو نظر آنا چاہیے۔

تنظیم کے ساتھ منسلک افراد کے آپس کے تعلقات اور باہمی محبت اور احترام کا دار و مدار سب سے بڑھ کر مقامی ناظم یا مقامی امیر کی شخصیت اور رویے پر ہے۔ اگر ناظم یا امیر تنظیم کے ساتھ ساتھ کارکنان کے باہمی تعلقات کا خیال رکھے، خود نرم خو ہو، کارکنان کی تربیت پر بھی توجہ دے، صرف سمع و اطاعت کا تقاضا نہ کرے بلکہ کارکنان کو مشورے میں شامل رکھے اور ان کے گھریلو اور ذاتی معاملات میں بھی دلچسپی لے، ان کے حالات سے اپنے آپ کو باخبر رکھے، کارکنان کو بھی تلقین کرے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ احسان اور محبت کا برتاؤ رکھیں تو پوری جماعت ایک مربوط ٹیم کے طور پر مل کر چلتی ہے۔ قرآن کریم کا حکم ہے:

وَلَا تَنسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ط (البقرہ ۲: ۲۳۷)

”آپس میں احسان اور مروت کے سلوک کو مت بھولو۔“

اللہ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَأَنفَضُوا مِنْ حَوْلِكَ (ال عمران ۱۵۹)

”پس اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لیے نرم بنادیے گئے ہیں اگر آپ سخت خواہاں اور دل کے سخت ہوتے تو یہ آپ سے چھٹ جاتے۔“

اس لیے نظامِ جماعت میں جہاں سمع و طاعت کی اہمیت بنیادی ہے وہاں مشاورت باہمی تعاون اور محبت کی معیشت بھی مسلمہ ہے۔

حسن ظن:

اس وقت جماعتِ اسلامی کی کھیتی اللہ کے فضل سے بہار دکھلا رہی ہے۔ اس سے جہاں کاشتکار کو خوشی اور مسرت ہوتی ہے وہاں مخالفین حسد اور بغض کا شکار ہیں۔ حسد اور بغض میں طرح طرح کی جھوٹی افواہیں پھیلا کر بے بنیاد الزامات عائد کرنا اور بدگمانیاں پیدا کرنا مخالفین کا عام طریق کار ہے۔ اس سے خود حضور نبی کریمؐ کو بھی سابقہ پیش آیا ہے۔ ایک اصلاحی تحریک کے لیے اس طرح کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین ہتھیار آپس میں حسن ظن ہے۔ بدگمانی سے بچنا مومن کا فرض ہے۔ اس سلسلے میں اخبارات کی خبروں اور تبصروں سے بھی خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسے تمام معاملات کی تحقیق کے لیے نظمِ بالا کے ساتھ ہر وقت کے رابطے کی ضرورت ہے۔

ہدایت ربانی ہے:

اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (الحجرات ۱۲:۳۹)

”بدگمانیاں کرنے سے بچو بعض اوقات محض گمان کرنے سے بھی گناہ لازم ہو جاتا ہے۔“

قرآن کریم کا حکم ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا (الحجرات ۶:۴۹)  
 ”اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو اگر کوئی فاسق کوئی خبر لے کر تمہارے پاس  
 آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔“

اخباری خبر کارکنانِ جماعت کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ نظمِ جماعت سے اس  
 کی تحقیق نہ کر لیں۔ چاہے وہ خبر کسی اپنے ہم خیال اخبار ہی کی کیوں نہ ہو۔

### توسیع دعوت:

کچھ عرصہ پہلے ہم نے جو ممبر سازی کی تھی اور رابطہ کمیٹیاں بنائی تھیں وہ جماعت کی  
 توسیع دعوت میں بہت مدد اور معاون ثابت ہوئی ہیں۔ اس کام سے غافل نہیں ہو جانا  
 چاہیے۔ ممبر سازی اور رابطہ کمیٹیوں کی تشکیل کا کام مسلسل جاری رہنا چاہیے اور ان کے  
 ساتھ ارکانِ جماعت اور ذمہ دارانِ جماعت کو مستقل رابطہ رکھنے کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔  
 عوام الناس تک دعوت پہنچانے اور جھوٹے مخالفانہ پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کا سب سے  
 موثر ذریعہ یہی رابطہ کمیٹیاں ہیں۔

## انتخابی حکمت عملی

### ووٹر تک رسائی:

جماعت اسلامی اپنی تنظیمی قوت کے باوجود قومی سطح پر الیکشن میں کبھی اچھی کارکردگی  
 نہیں دکھاسکی۔ ہمیں اپنی اس کمی کو دور کرنا ہے۔ اس کا صحیح طریقہ کار ایک ایک ووٹر تک پہنچنا  
 ہے۔ ووٹرسٹوں کی تصحیح میں دلچسپی لینا اور اپنے تمام ووٹروں کے ووٹوں کے اندراج اور صحت  
 کے بارے میں یقین حاصل کرنا ہر کارکن کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ یہ کام ایک



منصوبے کے مطابق کرنے کی ضرورت ہے اور فوری طور پر مقامی ناظمین اور مقامی امرا کو اس کی فکر کرنی چاہیے۔

اگر ووٹروں سے جماعت کے امیدوار کو ووٹ دینے کا کوئی عہد بروقت لیا جاسکے تو یہ مستحسن ہے۔ صرف دعوت دے کر ہی ایک آدمی کو نہیں چھوڑ دینا چاہیے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ قریب لانے اور کم از کم ووٹ کی حد تک ساتھی بنانے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ محض ایک بار مل لینا یا کوئی فارم پر کر لینا کافی نہیں، کوشش کریں کہ جن حضرات سے آپ کا ربط قائم ہوا ہے ان سے بار بار ملیں، ان کا اعتماد حاصل کریں، ان کے دکھ درد میں شریک ہوں، ان کے مسائل و مصائب سے باخبر رہیں اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح وہ آپ سے اور آپ کی جماعت سے پیوستہ ہو جائیں گے۔ اپنا ووٹ بنک بڑھانا اس وقت ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم جہاں ایک ایک ووٹر سے ملیں، وہاں برادریوں کے ان سربراہان سے بھی میل جول بڑھائیں جو عموماً دیہات کی سطح پر ووٹروں کو کنٹرول کرتے ہیں۔

### متبادل قیادت:

ہمیں پوری دیانتداری کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم ملک کے تمام طبقات تک دعوت پہنچانے کا پورا حق ادا نہیں کر سکے ہیں۔ مولانا مودودی نے اپنی ابتدائی تحریروں میں ایک رکن جماعت کا جو تصوراتی خاکہ پیش کیا تھا اس کے مطابق وہ اپنے ماحول کا مرجع و ماویٰ ہوگا۔ مظلوم اس کی طرف اُمید کی نظروں سے دیکھے گا۔ وہ شاہدِ عادل ہوگا اور ایک شفیق اور مہربان محبت کرنے والے فرد کی حیثیت سے اپنے علاقے کا لیڈر ہوگا۔

ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ہمارے ارکان، الا ماشاء اللہ، عملاً اس تصوراتی خاکے کی مثال بننے میں ناکام رہے ہیں۔ اس بحث میں پڑے بغیر کہ پرانے ارکان زیادہ معیاری

تھے یا نئے ارکان کی رکنیت کے معیار میں کمی آگئی ہے یا ہمیشہ ہی کمی محسوس کی جاتی رہی ہے؛ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی کمی پوری کرنے کی طرف توجہ دیں اور اس اعلیٰ کردار اور اخلاق اور عوامی خدمت کا نمونہ بننے کی کوشش کریں جو مقامی سطح پر قیادت کے بحران کو حل کرنے کا ذریعہ ثابت ہو۔ قومی سطح پر ایک اچھی قیادت اس وقت مل سکتی ہے جبکہ مقامی سطح پر لوگوں کو اچھی قیادت میسر ہو۔

### برادر تنظیموں سے رابطہ:

جماعت اسلامی اپنی برادر تنظیموں کے ساتھ مل کر ایک ایسی ہمہ گیر تحریک ہے کہ ملک کے ہر طبقے میں اس کی کوئی نہ کوئی شاخ موجود ہے۔ اس پوری تحریک کو متحرک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ برادر تنظیموں کے ساتھ مقامی اور ضلعی امیر کی سطح پر موثر رابطہ ہو۔ مہینے میں کم از کم ایک اجلاس ہو جس میں ضلعی، مقامی امرا اور برادر تنظیموں کے ذمہ داران شرکت کریں اور تحریک کے مشترک منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے مربوط منصوبہ بنائیں۔

## خواتین کا کردار

بچوں اور خواتین کے کام کی نگرانی کرنا اور ان کے ساتھ تعاون کرنا بھی جماعت کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

خواتین کے دائرے میں کام کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ شروع ہی سے جماعت میں اسے اہمیت حاصل رہی ہے اور علیحدہ نظم کے تحت کام جاری رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور ہماری خواتین کی محنت، قربانی اور توجہ سے کام میں ہر سطح پر غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ کچھ لوگ گھر میں بیٹھنے کی تعبیر یہ کرتے ہیں کہ دین کے کام کے لیے بھی باہر نہ نکلیں لیکن جب خواتین روزمرہ کاموں کے لیے اور حصول علم کے لیے مختلف ذمہ داریاں ادا کر رہی ہیں تو دین کے محاذ پر جہاں مخالفین نے خواتین کو خصوصی ہدف بنا رکھا

ہے وہ کس طرح خاموش رہیں اور کیوں رہیں!

خواتین نے کام کے مختلف راستے نکالے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مرد کارکنوں کو چاہیے کہ وہ ہر سطح پر ان کی حوصلہ افزائی کریں اور ہر ممکن حد تک ان کی مدد اور اعانت کریں۔ گھروں میں بچوں کو لڑکوں اور لڑکیوں کو جو دین کی راہ پر آگے بڑھ رہے ہوں، والدین کی جانب سے سرپرستی اور حوصلہ افزائی ملنا چاہیے۔ جو دین کی راہ میں آگے بڑھتے ہیں، وہ دنیوی کیریئر کے لحاظ سے بھی نقصان میں نہیں رہتے۔ ہمارے بڑوں کو بچوں کو دین کی راہ پر شعوری طور پر آگے بڑھانا چاہیے اور اس کے لیے تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔

## فریضہ اقامت دین - چند عملی پہلو

### اختلافی مسائل میں اعتدال کی روشنی:

ہمارے کام کو آگے بڑھانے اور عوام الناس میں اسے تعارف کرانے کا ایک اہم ذریعہ مساجد ہیں۔ کوئی بھی دینی تحریک مساجد کو مرکز بنائے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس غرض کے لیے علمائے کرام سے بلا تفریق مسلک باہمی احترام اور تعاون کا تعلق پیدا کرنے کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ یہ کام انتہائی صبر اور حوصلے سے کرنے کا ہے۔ جماعت اسلامی کی پالیسی ایک عرصہ سے یہی ہے کہ ہر مسلک کے علماء کا احترام کیا جائے اور اگر ان کی طرف سے کوئی شکایت پیدا ہو تو افہام و تفہیم اور باہمی رابطے کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں علمائے کرام کے کسی بھی گروہ کے خلاف محاذ آرائی سے ہر قیمت پر بچنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم تو اٹھتے ہی دلوں کو جوڑنے اور امت کو ایک بنیاد پر موقوف بنانے کے لیے ہیں:

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی



جماعت کے ارکان اور کارکنان کو فروعی مسائل میں سخت موقف اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے اور فروعی مسائل میں عموماً جمہور کی رائے کا احترام کرنا چاہیے۔ اگرچہ خود ذاتی طور پر ہر رکن جماعت کو اپنے مسلک کے مطابق رائے رکھنے اور عمل کرنے کی آزادی ہے۔

### کمزوریوں اور خامیوں پر نظر رکھنا:

دعوت الی اللہ کا تقاضا ہے کہ کارکنان جماعت اپنی کمزوریوں پر نظر رکھیں اور کسی طرح کی بڑائی، گھمنڈ، خود پسندی اور احساسِ تفاخر میں مبتلا نہ ہوں۔ دوسروں کو یہ احساس دلانا کہ وہ کم تر ہیں اور آپ ہدایت یافتہ ہیں یا اخلاقی اور دینی لحاظ سے کسی برتر مقام پر فائز ہیں۔ داعی الی اللہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اللہ کا حکم ہے:

فَلَا تَزْكُوا أَنْفُسَكُمْ (النجم: ۵۳: ۳۲)

”اپنی پاکیزگی کے گھمنڈ میں مبتلا مت ہو۔“

عجز و انکسار دانا لوگوں کا شیوہ ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنے والوں کے لیے حضور نبی کریم کی نوباتوں والی حدیث مشعلِ راہ ہے:

”أَمَرَ رَبِّي بِتَسَعٍ. خَشْيَةِ اللَّهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ وَكَلِمَةِ الْعَدْلِ فِي الْغَضَبِ وَالرِّضَا وَالْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنَا وَأَنْ أَصِلَ مَنْ قَطَعَنِي وَأَعْفُو مَنْ ظَلَمَنِي وَأُعْطِيَ مَنْ حَرَمَنِي وَأَنْ يَكُونَ صَمْتِي فِكْرًا وَنُطْقِي ذِكْرًا وَنَظْرِي عِبْرَةً.“

”میرے رب نے مجھے نوباتوں کا حکم دیا ہے۔ کھلے اور چھپے اللہ سے ڈروں، غصے اور رضامندی دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں اور فراخ دستی میں میانہ روی اختیار کروں۔ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھ پر ظلم کرے

میں اسے معاف کروں، جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں۔ میری خاموشی فکر مندی کی خاموشی ہو، میری بات اللہ کے ذکر کی بات ہو، میری نظر عبرت کی نظر ہو۔“

اور اس کے بعد حضور نبی کریمؐ نے فرمایا:

وَأَنَّ أَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَانْتِهَى عَنِ الْمُنْكَرِ

”اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں۔“

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنے والے جماعت اسلامی کے کارکنوں کے لیے حضور نبی کریمؐ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ اس حدیث نے دعوت دین دینے والوں کے لیے ایک بلند معیار اخلاق کی نشان دہی کر دی ہے۔ عوام و خواص سے رابطہ پیدا کرنے کے لیے داعی کا فرض ہے کہ وہ حسن خلق کے بلند نمونے پر ہو۔ خندہ پیشانی اور گرم جوشی سے ملنا حسن اخلاق کا بنیادی تقاضا ہے۔ کسی کی شخصیت کے بارے میں پہلا تاثر اس کے ساتھ پہلی ملاقات اور اس کے ملنے کے انداز سے قائم ہوتا ہے۔

### عمومی رویہ:

جماعت اسلامی کے ذمہ داران اور ارکان کے رویے کے بارے میں ایک عمومی شکایت یہ کی جاتی ہے کہ ان کا مزاج مجلسی نہیں بلکہ دفتری ہے۔ اس شکایت میں کسی حد تک صداقت پائی جاتی ہے۔ دفاتر میں عام طور پر ذمہ داران دفتری کاموں میں اُلجھے ہوئے ہوتے ہیں اور آنے جانے والوں کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتے حالانکہ دفتر میں بیٹھنے کا اصل مقصد رابطہ عوام اور رابطہ کارکنان ہے۔ دفتر میں بیٹھ کر فائلوں میں گم ہو جانا کہ آنے جانے والوں کی طرف کوئی دھیان ہی نہ ہو تعلقات میں نقصان کا باعث بنتا ہے۔ سنجیدہ مطالعے یا سنجیدہ لکھنے پڑھنے کا کام کرنا ہو تو الگ تھلگ جگہ میں بیٹھنا چاہیے۔ اگر آپ کسی

جگہ میں بیٹھے ہوئے ہیں جہاں لوگوں کا عام آنا جانا ہے تو خندہ پیشانی سے لوگوں کا استقبال کرنا، سلام کا محبت کے ساتھ جواب دینا، گرم جوشی سے مصافحہ یا معافہ کرنا آپ کا فرض ہے۔ آنے والے کو یہ تاثر دینا ضروری ہے کہ آپ کو اس سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ آپ اسے بوجھ نہیں سمجھتے اور نہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کے کام میں مخل ہوا ہے۔ جماعت اسلامی کے دفاتر میں بیٹھنے والوں کا بہت اہم کام یہی ہے کہ وہ عوام اور کارکنان کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ عوام ان کی طرف اپنے مسائل کے حل کے لیے رجوع کریں وہاں سے تسلی، رہنمائی اور امداد حاصل کریں۔ اگر آپ ان کی اور کوئی مدد نہ بھی کر سکیں لیکن انھیں صرف اتنا احساس ہی دلا دیں کہ آپ کو ان سے محبت ہے، آپ نے ان کے کام میں دلچسپی لی ہے، آپ ان کے ہمدرد ہیں، آپ دل سے ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو اکثر لوگ بڑی حد تک مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن اگر آپ کا رویہ اس کے برعکس ہو تو بسا اوقات آپ لوگوں کا کام بھی کر لیتے ہیں لیکن رویے کی خشکی کی وجہ سے ان کو ناراض کر لیتے ہیں۔

### برتری کا احساس:

جماعت کے ارکان سے ایک عمومی شکایت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے آپ کو بہت ہدایت یافتہ اور بہتر مسلمان سمجھتے ہیں اور عام مسلمانوں کو دین کے لحاظ سے کمتر اور راستے سے بھٹکا ہوا سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ جماعت کے بارے میں اس تاثر کا شکار ہیں کہ یہ اپنے آپ ہی کو صحیح مسلمان سمجھتے ہیں۔ کچھ مخالفین جان بوجھ کر بھی یہ تاثر پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس جماعت کے بارے میں یہ تاثر عام کرنے کے لیے ان پر صالحین کی پھبتی کتے ہیں۔ جماعت کے ارکان اور کارکنان کا فرض ہے کہ مخالفین کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ عوام اور جماعت کے کارکنان اور ارکان کے درمیان خلیج حائل کر سکیں۔ ظلم کے موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کے لیے اللہ کے بعد مسلمان عوام ہی ہمارا سب سے بڑا سہارا ہیں۔ مخالفین کی کوشش ہے کہ



مسلمان عوام کو ہم سے دور رکھا جائے اور انھیں یہ تاثر دیا جائے کہ یہ لوگ تو احساس برتری کا شکار ہیں۔ آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ صرف اپنے آپ کو ہی صحیح مسلمان سمجھتے ہیں۔ آج کل سیکولر طبقے نے یہ تاثر عام کرنے کے لیے بنیاد پرست (Fundamentalist) کی اصطلاح بھی ایجاد کر لی ہے۔ اس طرح سے وہ مسلمانوں کے اندر دین کے لحاظ سے الگ الگ طبقے (Categories) پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عام مسلمانوں میں گھل مل کر کام کریں۔ ان سے محبت کریں اور انھیں یہ احساس دلائیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایمان کی نعمت سے نوازا ہے۔ وہ قیمتی انسان ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی کو معلوم نہیں کہ اللہ کو کسی عام مسلمان کا کوئی عمل اتنا پسند ہو کہ وہ اسے بلند درجات عطا فرمادے اور جو اپنے آپ کو بڑا برگزیدہ سمجھتا ہو اس کے اعمال کو ضائع کر دے۔ ہر وقت اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہماری نظر اپنی کوتاہیوں پر ہوگی تو ہم کبھی بھی احساس برتری کا شکار نہیں ہوں گے:

نہ تھی اپنی برائیوں پر جو نظر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر  
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا  
اللہ کی طرف دعوت دینے والے کو عجز و انکسار سے کام لینا چاہیے۔ یہی لوگوں کے دلوں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

کردار کی کشش:

• تحریک اسلامی آج ایک عظیم مستقبل کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ باطل کی ہر قوت اور اللہ سے بے نیاز قیادتوں کا ہر ٹولہ ناکام رہا ہے۔ حالات تبدیلی کا تقاضا کر رہے ہیں لیکن تبدیلی نہ آپ سے آپ آئے گی اور نہ ایسے حالات میں آئے گی کہ اللہ کی طرف بلانے والوں کے کردار اور نمونے میں وہ روشنی اور وہ مقناطیسیت نہ ہو جو اللہ کے نبیوں اور ان کے مخلص

۲۱۷ ————— مضامین قاضی حسین احمد

پیر و کاروں کا طرہ امتیاز رہی ہے۔ یہ بھی اللہ ہی کا قانون ہے کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، برف ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور آگ جلاتی ہے اور یہ بھی سنت الہی ہے کہ جب دعوتِ حق پہنچانے والوں کے قول و فعل سے اس پیغام کی پر نور شعاعیں پھوٹتی ہیں، جس کی علم برداری کے وہ دعوے دار ہیں تو پھر تاریکیاں چھٹنے لگتی ہیں، دعوتِ حق انسانوں کے دلوں میں اترنے لگتی ہے، ہر داعی لوگوں کی توجہ کا مرکز اور محور بن جاتا ہے اور غلبہٴ حق کی راہ کی ہر مشکل آسان ہونے لگتی ہے۔ سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی پیغام اور رہنمائی ہے اور ہر دور میں اسلام کی طرف بلانے والے اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب وہ اس اسوۂ مبارکہ میں رچ بس جائیں اور ان کے اخلاق ان کے کردار ان کے معاملات اور ان کے تعلقات اس سانچے میں ڈھل جائیں جو سرورِ دو عالم نے ان کے لیے تیار کیا اور جو ابد تک تحریکِ اسلامی کا آئیڈیل اور نمونہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین!

(جنوری ۲۰۰۰ء)

## آئیے حالات درست کریں

اندھیری شب میں کسی بے نشان صحرا سے گزرتے ہوئے قافلے سے بچھڑ جانے والے تنہا مسافر کی پریشانی کو تصور میں لائیں۔ اس کے لیے سب سے بڑا نجات دہندہ اور محسن وہ شخص ہوگا جو اس کے راستے کو روشن کر دے اور اسے منزل کا پتا بتا دے۔ انسانیت بھی اسی طرح بھٹک رہی تھی۔ عام لوگ اپنے خالق کی معرفت سے محروم تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ کس نے انھیں پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا۔ انھیں زندگی کس طرح گزارنی چاہیے، حلال کیا ہے، حرام کیا ہے، انھیں کہاں جانا ہے، اپنے جیسے انسانوں پر اس کے کیا حقوق ہیں، اس کے خالق کے کیا حقوق ہیں اور وہ اپنے پروردگار اپنے خالق و مالک کو کیسے راضی کر سکتا ہے؟ انسانیت کو یہ رہنمائی اس کے محسن اعظم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ملی اور یہ روشنی اور سیدھا راستہ قرآن کریم نے دکھایا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ھُدٰی لِّلنَّاسِ وَبَيَّنَّتْ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ (البقرہ ۲: ۱۸۵) یعنی لوگوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کی واضح نشانیاں قرار دیا ہے۔ اس رہنمائی (نزول قرآن) کے لیے رمضان المبارک کے مہینے کو چنا گیا۔ اس احسانِ عظیم کی شکرگزاری کے لیے ہمیں موقع دیا گیا کہ اس ماہ مبارک میں اللہ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے کے لیے روزے رکھیں اور زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کریں۔ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (البقرہ ۲: ۱۸۵) اور تاکہ تم اللہ کی عطا کردہ ہدایت پر اس کی



کبریائی بیان کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔

رمضان کے مبارک مہینے کے روزوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ یعنی اپنے اعمال کے بارے میں اپنے رب کے سامنے جواب دہی کا احساس پیدا ہو۔ وہ اپنے رب کا ذکر کرتا رہے دل سے بھی اس کی کبریائی بیان کرے زبان سے بھی اور جسم کو بھی کھانے پینے اور دوسری لذات سے روک کر رکھے۔ یہ تمام اعمال اللہ کی شکرگزاری کے مظہر ہیں اس بات پر کہ اس نے ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دی۔ روزے رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ برائی اور بے حیائی کے ہر کام سے اجتناب کیا جائے اپنی زبان کی حفاظت کی جائے جھوٹ، غیبت اور گالم گلوچ سے زبان کو پاک رکھا جائے تراویح میں قرآن کریم سننے کا اہتمام کیا جائے اور قرآن کریم کی تعلیمات سے کما حقہ آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ترجمان القرآن کے قارئین کو رمضان المبارک کی زیادہ سے زیادہ برکات سمیٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رمضان المبارک کی عین آمد کے موقع پر امریکہ نے ایک بار پھر عراق کے مظلوم مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ رات کی تاریکی میں بے خبر اور معصوم انسانوں پر اندھا دھند میزائلوں کی بارش کر کے سینکڑوں بے گناہوں کو ان کے خون میں نہلا دیا گیا۔ ہسپتالوں، یونیورسٹیوں اور عبادت گاہوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو بھی دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا۔ امریکہ دراصل یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ پوری دنیا کے سیاہ و سفید کا بلا شرکت غیرے مالک ہے اور اسے ہر جگہ اپنی مرضی کے مطابق مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے اور اس کے حکم سے سرتابی کرنے والے کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے مسلمان حکمرانوں کو جب اس طرح کی کوئی سزا ملتی ہے تو اس وقت ان کو اسلامی تضامن اور امت کا

اتحاد یاد آ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات اب ثابت شدہ حقیقت ہے کہ استعماری طاقتوں کے مقابلے میں اپنا تحفظ کرنے کے لیے مسلمانانِ عالم کے سامنے اتحادِ اُمت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ عراق پر حملے سے قبل افغانستان اور سوڈان کو جس طرح اچانک حملے کا نشانہ بنایا گیا، اسی سے تمام مسلمان حکمرانوں کو عبرت پکڑنی چاہیے تھی لیکن آج بھی بیشتر مسلمان حکومتوں کا یہ حال ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مصیبتوں سے بے خبر صرف اپنے مفادات اور اغراض سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ایک طرف امریکہ مسلمانوں کو اتحاد سے محروم اور انتشار سے دوچار کر کے ان کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دینا چاہتا ہے اور دوسری طرف حکومت پاکستان امریکہ سے یہ آس لگائے بیٹھی ہے کہ وہ اسے اقتصادی بحران سے نکالنے کے لیے کوئی موثر اقدام کرے گا اور عالمی مالیاتی اداروں کو اس کی امداد کی ترغیب دلائے گا۔ اس مقصد کے لیے میاں نواز شریف نے صدر کلنٹن سے ملاقات کی درخواست کی اور امریکہ کے دورے کی دعوت حاصل کی، لیکن اس دورے کے جو نتائج سامنے آئے ہیں، انھیں سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دورہ نہ کرنا زیادہ باوقار رویے کا اظہار ہوتا۔ کیونکہ نہ صرف پاکستان کے موقف کو تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ پاکستانی وفد کی سبکی اور توہین بھی کی گئی۔ تقریباً ایک سو افراد کا بھاری بھر کم وفد لے کر جانے اور کروڑوں روپے کے اخراجات کے باوجود میاں نواز شریف بے آبرو ہو کر واپس لوٹے تو یہ محض وزیرِ اعظم کی بے عزتی نہیں بلکہ پوری قوم کی سبکی ہے۔ کیسی عبرت ناک بات ہے کہ کشکول توڑنے کے منشور پر ووٹ حاصل کرنے کے بعد موجودہ حکومت پوری دنیا میں ہر طرف کشکول لیے پھر رہی ہے۔ مگر ہر طرح کی خوشامد کے باوجود کشکول خالی واپس آ جاتا ہے۔ اس ضمن میں تشویشناک بات یہ ہے کہ حکومت پاکستان اقتصادی مشکلات سے گھبرا کر نیوکلیئر ہتھیار جیسی اہم دفاعی سدِ جارحیت کی صلاحیت کو بھی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہے۔



امریکی نائب وزیر خارجہ ٹالبوٹ نے اپنے مضمون میں جو پاکستان کے اخبارات میں بھی چھپا ہے بالکل واضح کر دیا ہے کہ امریکہ کی یہ کمیونٹ ہے کہ این پی ٹی پر دستخط کروا کے سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممبران کے علاوہ دوسرے ہر ملک کو نیوکلیر ہتھیار بنانے کے حق سے محروم کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے امریکی حکومت جس تدریج سے آگے بڑھ رہی ہے مسٹر ٹالبوٹ نے اس کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ یعنی وہ سی ٹی بی ٹی کے بعد ایم سی ٹی اور پھر این پی ٹی کے ذریعے کامل ”ڈی نیوکلیرائزیشن“ کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس واضح اعلان کے بعد یہ کہنا کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط سے کوئی فرق نہیں پڑے گا قوم کو دھوکا اور فریب دینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ نہایت خطرناک بات ہے کہ امریکہ کو یقین دہانی کرا دی گئی ہے کہ پاکستان سی ٹی بی ٹی پر ۱۹۹۹ء میں کسی بھی وقت دستخط کر دے گا۔ یہ بات طاقتور بھارتی حریف کے مقابلے میں پاکستان کو بے بس اور بے سہارا بنانے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد ہمارے اندر یہ سکت باقی نہیں رہے گی کہ کشمیر کے معاملے میں اپنے اصولی موقف پر قائم رہ سکیں یا کشمیری مجاہدین کی کسی بھی قسم کی امداد کر سکیں۔

موجودہ حکومت ہر محاذ پر مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے۔ اس کی سب سے بڑی ناکامی اور نامرادی تو یہ ہے کہ یہ اقتصادی خوشحالی کا بلند بانگ دعویٰ لے کر آئی تھی لیکن ”بھاری مینڈیٹ“ حاصل کرنے کے باوجود اس میدان میں گزشتہ تمام حکومتوں سے زیادہ نااہل ثابت ہوئی ہے۔ تاجروں اور صنعت کاروں نے اس حکومت سے جو امیدیں وابستہ کیں تھیں وہ چکنا چور ہو گئی ہیں۔ صنعتیں بند پڑی ہیں اور مزید صنعتیں بند ہو رہی ہیں۔ تجارت صرف ان بنیادی ضرورتوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جو قوت لایموت کے لیے ناگزیر ہیں۔ زرعی پیداوار میں بھی مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے اور کپاس وغیرہ کی فصلوں کے لیے جو ہدف طے کیا گیا تھا وہ بھی حاصل نہیں ہو سکا۔ درآمدات اور برآمدات دونوں میں کمی ہوئی ہے جو



صنعتی زوال کی مظہر ہے۔ مہنگائی مسلسل بڑھ رہی ہے، نجکاری کے عمل کے نتیجے میں لاکھوں لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں، حکومتی ادارے مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں، انتظامیہ اور عدلیہ کی ناکامی کا اعتراف فوج کو بے پناہ اختیارات دے کر کیا جا رہا ہے۔ ریلوے اور واپڈ اکمل بربادی کے قریب ہیں۔ صرف ان دو اداروں کے لاکھوں مزدوروں میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے لاکھوں اساتذہ، کلرک اور سفید پوش طبقے کے ملازمین بنیادی ضروریات کے لیے ترس رہے ہیں۔ غرضیکہ پوری قوم ایک پکے ہوئے لاوے کی مانند پھوٹ پڑنے کو ہے۔

اقتصادی اور معاشی زوال کے ساتھ ساتھ پوری قوم اخلاقی زوال سے بھی دوچار ہے۔ بے حیائی اور فحاشی کے نتیجے میں ہمارا خاندانی اور عائلی نظام، جو امت مسلمہ کا طرہ امتیاز تھا، بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ والدین اور اولاد کے درمیان تعلقات مستحکم نہیں رہے، خواتین کا احترام ختم ہو رہا ہے۔ روزانہ کے اخبارات اخلاق سوز واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ خودکشی کے روز افزوں واقعات قوم کے اخلاقی زوال کا ثبوت ہیں، اس لیے کہ خودکشی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ مسلمانوں کے معاشرے میں خودکشی کرنے والوں کی نماز جنازہ تک نہیں پڑھی جاتی۔ یہ نہایت درجے کی بے ہمتی، کج روی اور کم حوصلگی ہے کہ ایک شخص خود کو جہنم کی آگ میں جھونک ڈالے۔ مگر مغربی معاشرے کے زیر اثر بے حیائی اور فحاشی کے دوسرے مظاہر کے ساتھ ساتھ خودکشی کا قبیح عمل بھی ہمارے معاشرے میں نفوذ کر رہا ہے۔ اس کو جو فراہم کرنے کے لیے غربت کی دلیل دی جاتی ہے جو قطعاً غلط ہے۔ دراصل یہ رجحان اخلاقی پستی کی وجہ سے ہے۔ صرف اللہ اور روز آخرت پر ایمان سے محروم شخص ہی خودکشی کر سکتا ہے۔ تاہم ہمارے حکمران قوم کے اخلاقی زوال میں تیزی سے اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ اور کرپشن کا کلچر عام کیا جا رہا ہے۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اگر روشنی کی کوئی کرن موجود ہے اور ملک و قوم کو سہارا دینے کی صلاحیت کہیں نظر آتی ہے تو وہ ہمارے نوجوان ہیں جو اس خود غرض مادہ پرست اور نفس کی بندگی کے ماحول سے نکل کر جہاد کی زندگی اختیار کر رہے ہیں۔ الحمد للہ ہزاروں کی تعداد میں ایسے نوجوان موجود ہیں جو اس انتظار میں ہیں کہ کسی طرح انھیں کشمیر، فلسطین، بوسنیا اور چیچنیا وغیرہ میں مظلوم مسلمانوں کا سہارا بننے کا موقع ملے۔ جہاد کا جذبہ اور شہادت کی آرزو لیے ہوئے یہ نوجوان پہاڑی کے چراغ ہیں۔ مغربی ثقافت اور بود و باش کے مقابلے میں جہادی کلچر عام کرنے کے لیے نوجوان تنظیموں نے غیر معمولی کام کیا ہے۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ ہماری قوم کے تن مردہ میں زندگی کے شرارے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ پر جہاں بھی کوئی افتاد پڑتی ہے ہمارے گلی کوچوں میں انھی مذہبی تنظیموں کے نوجوان علمائے کرام اور ائمہ مساجد کے ذریعے قوم کے اجتماعی ضمیر کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بڑی پارٹیاں کہنے والوں کا تو وجود بھی مصیبت کے وقت کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ افغانستان یا سوڈان پر حملے ہوں یا عراق پر حالیہ امریکی حملہ ان نام نہاد بڑی پارٹیوں کے رویے سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ان میں اُمت کی اجتماعی مفاد یا غم و الم سے کوئی غرض نہیں۔ دراصل یہ نام نہاد بڑی پارٹیاں مفاد پرستی، خود غرضی اور اسٹیبلشمنٹ کے سہارے پر قائم ایسے گروپ ہیں جو عوام کے لیے سراسر اجنبی ہیں لیکن اپنے سرمائے، روایتی جاگیردارانہ رعب داب اور اثر و رسوخ کی وجہ سے بے زبان اور بندھنوں میں جکڑے ہوئے عوام پر تسلط حاصل کر لیتے ہیں۔ اُمت پر جب کبھی کوئی افتاد پڑتی ہے تو گلی کوچوں میں جماعتِ اسلامی کے کارکن نظر آتے ہیں یا علماء کے کچھ گروہ سراپا احتجاج دکھائی دیتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک کے مذہبی رہنما درِ مشترک اور قدرِ مشترک رکھنے کے



باوجود اپنے اپنے مسلک کی حد سے بڑھی ہوئی محبت کی وجہ سے مشترک چیلنج کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ ان میں قربانی کے جذبے اور دین کے ساتھ گہرے لگاؤ کی کمی نہیں، لیکن باہمی یگانگت اور یکسوئی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی قوتیں آپس میں ٹکرا کر ضائع ہو رہی ہیں۔ ماضی میں مختلف مسلکوں سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام کے درمیان اتحاد یکجہتی پیدا کرنے کی متعدد کوششیں کی گئیں، وقتی طور پر اس کے کچھ نتائج بھی برآمد ہو جاتے ہیں لیکن موجودہ حالات میں اس بات کے امکانات کم نظر آتے ہیں کہ یہ متحد ہو کر کسی بڑے چیلنج کے مقابلے میں ہراول دستہ بن سکیں۔ ملک کے ہر گلی کوچے میں مخلص اور نیک دل افراد موجود ہیں لیکن تنہا کسی فرد کے لیے ممکن نہیں کہ اچھے جذبات رکھنے کے باوجود کوئی بڑا نتیجہ پیدا کر سکے۔ بڑے نتائج حاصل کرنے کے لیے اور ہمہ گیر اور ہمہ پہلو اصلاح کے لیے کسی بڑی اجتماعی تحریک کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں پورے ملک میں نظر جماعت اسلامی ہی پر ٹھہرتی ہے جس کی تنظیمی صلاحیتوں، مقصد کے ساتھ لگن اور امانت و دیانت کے اعلیٰ معیار کے اس کے مخالفین بھی قائل ہیں۔ اکتوبر ۹۸ء میں اسلام آباد کے اجتماع میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی اور قومی اور بین الاقوامی پریس نے بھی اس کا اعتراف کر لیا ہے کہ جماعت اسلامی اپنی تنظیمی صلاحیتوں کے لحاظ سے اس ملک اور قوم کے لیے ایک نعمت ہے۔ دولاکھ سے زیادہ لوگوں (مردوں، عورتوں اور بچوں) کو شامیانوں کے ایک شہر میں بسانا، انھیں ملک کے مختلف حصوں سے جمع کرنا اور پھر پرامن طور پر انھیں اپنے گھروں تک واپس پہنچانا، ان کی ساری ضروریات پوری کرنا اور محبت و یکجہتی کی فضا میں ان کو باہم شیر و شکر کر کے ایک خاندان میں تبدیل کر دینا، افراتفری اور بد امنی کے اس ماحول میں روشنی کا ایک مینار ہے۔ اس سے ملک بھر میں مخلص اور نیک لوگوں کو حوصلہ اور روشن مستقبل کا سراغ ملا ہے لیکن اپنی موجودہ شکل میں جماعت اسلامی ہی قوم کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں۔ جماعت اسلامی



کے کارکنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرے کے تمام اچھے اور اہل افراد کو جذب کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے ملک میں جب بھی کوئی شدید بحران آتا ہے، لوگ حکمرانوں کے ظلم و زیادتی اور بدعنوانی سے پریشان ہو جاتے ہیں اور تبدیلی کی خواہش تیز تر ہو جاتی ہے تو اس کا حل اکثر ایک ایک نکاتی ایجنڈے میں تلاش کیا جاتا ہے اور یہ نکتہ حکومت سے نجات حاصل کرنے پر مبنی ہوتا ہے۔ مختلف ان خیال عناصر پر مشتمل اتحاد تشکیل پاتے ہیں، وقتی طور پر متفقہ منشور بھی پیش کیے جاتے ہیں لیکن مختلف اور متنافر عناصر جو اپنے سینوں میں مختلف خیال اور آرزوئیں پالتے ہیں، حکومت کو گرانے کا منفی منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچتے ہی ایک بار پھر منتشر ہو جاتے ہیں اور قوم کو اسی مفاد پرست اور خود غرض ٹولے کے چنگل میں چھوڑ جاتے ہیں جو ہر بار ایک نیا اور مختلف لبادہ اوڑھ کر سامنے آ جاتا ہے۔ جماعت اسلامی بھی کئی مرتبہ اس تجربے سے گزری ہے۔ بھٹو کے خلاف قومی اتحاد ہو یا اسلامی جمہوری اتحاد اس کی روح رواں جماعت اسلامی ہی تھی لیکن ان تحریکوں کے نتیجے میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں آ سکی اور ہر بار وہی مفاد پرست طبقہ نام بدل کر برسرِ اقتدار آتا رہا۔ نواز شریف کے بعد بے نظیر، بے نظیر کے بعد نواز شریف، نواز شریف کے بعد پھر بے نظیر، بے نظیر کے بعد پھر نواز شریف، اس عمل سے گزرنے کے بعد یہ دونوں جماعتیں (اصل میں دونوں ایک ہیں) عوام کی نظروں سے گر چکی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ عامۃ الناس نواز شریف سے بھی سخت بیزار ہو چکے ہیں، بے نظیر کی قیادت لوگوں کے دلوں میں کوئی اُمنگ پیدا نہیں کر سکتی۔ جو لوگ بے نظیر کے گرد جمع ہو کر الائنس بنا رہے ہیں نہ تو قوم کو کوئی لائحہ عمل دے سکیں گے اور نہ ہی لوگ ان کا ساتھ دے کر کسی قربانی کے لیے آمادہ ہوں گے۔ اس وقت ملک کے عوام انقلابی اور نتیجہ خیز (Radical) اقدامات کی تمنا کر رہے ہیں۔ عوام چاہتے ہیں کہ ایسے سراپا اخلاص لوگ اقتدار میں آئیں جو نہ صرف ملک کی خستہ اور دردماندہ حالت میں انقلاب لائیں اور امن و

امان کی صورت حال درست کریں بلکہ موجودہ خود غرضانہ اور مادہ پرستانہ ماحول کو بھی یکسر بدل ڈالیں اور قوم کو مکمل اخلاقی زوال سے بچالے جائیں۔ اس کام کے لیے انقلابی لوگوں اور انقلابی پروگرام کی ضرورت ہے۔ موجودہ سسٹم یا سیاست دانوں اور اسٹیلشمنٹ میں یہ صلاحیت سرے سے موجود ہی نہیں کہ وہ اپنی اصلاح آپ کر سکیں۔

اگر ایک بار پھر اسی ڈھنگ اور اسی ڈھب پر انتخابات ہوتے ہیں جس کی اس ملک میں ریت چلی آ رہی ہے تو ووٹرز بڑی حد تک اس عمل سے لاتعلق ہو جائیں گے۔ پنجاب کے حالیہ بلدیاتی انتخابات میں لوگوں نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ رائے دہندگان کی فہرست میں پچاس فیصد اندراجات غلط ہیں۔ جن لوگوں کے ووٹ بنے ہوئے ہیں وہ علاقے میں موجود ہی نہیں ہیں اور جو موجود ہیں ان کے ووٹ ہی نہیں ہیں۔ حکومتی مشینری راتوں رات پولنگ اسکیم کو تبدیلی کر لیتی ہے۔ ووٹر حیران اور پریشان اپنے پولنگ اسٹیشنوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اس سے وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو جعلی ووٹ بھگتانے کے فن میں ماہر ہیں۔ وہ سرکاری مشینری کو استعمال کر کے اپنی ”مہارت“ کو رو بہ عمل لاتے ہیں۔ پھر الیکشن کمیشن غیر جانبدار اور آزاد نہیں ہے۔ ایک ایک حلقے کے اندر بیس بیس ہزار جعلی شناختی کارڈ بنے ہوئے ہیں۔ پولنگ سے ایک روز قبل غریب لوگوں میں راشن اور پیسے تقسیم کر کے شناختی کارڈ لے لیے جاتے ہیں۔ اس طرح عوام کی اکثریت انتخاب کے عمل سے ہی مایوس ہو چکی ہے اور ۸۰ فیصد لوگ پولنگ اسٹیشنوں کے قریب پھٹکنے سے بھی ڈرتے ہیں۔

اصلاح کا واحد راستہ ہے کہ مایوس لوگوں کے دلوں میں اُمید کی شمع روشن کی جائے۔ ملک بھر کے ہر گلی کوچے میں لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی قسمت آپ بنانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد ۱۱:۱۳)



”حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔“ ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام الناس کو مایوسی اور قنوطیت سے نکالا جائے اور ان کے دلوں کو یقین کی روشنی سے معمور کر دیا جائے۔ اس لیے کہ اللہ کی رحمت سے مایوسی کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ لَا يَأْتِسُ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ (یوسف ۸۷: ۸۷) ”اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں“ ہم تو دنیا میں اُمید کی روشنی عام کرنے آئے ہیں۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم پوری انسانیت کو یقین دلائیں کہ اللہ کا دامن رحمت بہت وسیع ہے۔ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ (الزمر ۵۳: ۳۹) ”اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ“ اور وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (ال عمران ۱۳۹: ۳) ”دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔“

یہ وقت ہے کہ اس قوم کے ہر فرد کے دل کو ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال کر دیا جائے۔ پاکستان کے ہر مزدور، کسان، طالب علم، کلرک، استاد اور نچلے و متوسط طبقے کے سفید پوش، باشعور شہری، قوم و ملک کا درد رکھنے والے ہر دانشور اور ہر درد مند پاکستانی کا تعاون حاصل کیا جائے۔ انھیں اس تحریک کے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک مکمل، ہمہ گیر اور ہمہ پہلو انقلاب کی منصوبہ بندی کی جائے۔ رمضان المبارک کے اس مہینے کو اس عظیم الشان تحریک کی تیاری کے لیے استعمال میں لایا جائے اور جیسے ہی مناسب موقع آئے ایک عظیم الشان اور بابرکت انقلاب برپا کرنے کے لیے عوام سے سڑکوں اور گلی کوچوں میں نکلنے کی اپیل کی جائے۔ اس تحریک کو انتہائی منظم اور پر امن رکھا جائے تاکہ ملک کو مزید انتشار اور بد امنی اور موقع پرست طالع آزمائوں کی دستبرد سے بچایا جاسکے۔ اس تحریک کے ذریعے حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کو مجبور کر دیا جائے کہ ملک کی باگ ڈور ایسے مخلص لوگوں کے سپرد کر دیں جو اسے موجودہ اندھیروں سے نجات دلا سکیں۔



ہمارے ملک کا دستور ایک اسلامی انقلابی دستور ہے۔ اس میں ۱۹۴۹ء میں پاس کی گئی وہ قرارداد مقاصد بھی شامل ہے جو بجائے خود ایک انقلابی دستاویز ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو اور اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ملک کو قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق چلایا جائے گا۔ ہمارے دستور میں قرارداد مقاصد کو قومی رہنمائی اور قانون سازی کی بنیاد تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارے دستور کی دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کے مطابق کوئی ایسا شخص کسی اسمبلی کا نہ امیدوار بن سکتا ہے اور نہ کسی اہم عہدے پر فائز رہ سکتا ہے۔ جو امین نہ ہو جو فرائض ادا نہ کرتا ہو جو بڑے گناہوں سے اجتناب نہ کرتا ہو اور اچھی شہرت نہ رکھتا ہو۔

یہ انقلابی دستور تو موجود ہے لیکن اس پر عمل درآمد کا کوئی نظام موجود نہیں۔ عوامی دباؤ کے تحت دستور میں اسلامی دفعات تو رکھی گئیں لیکن ملک کی زمام اقتدار انگریز کے تربیت یافتہ سیاست دانوں اور اسٹیلشمنٹ کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ وہ اس ملک کے دستور کے خلاف اس پر مسلط رہے۔ اب اس ملک کو اسلامی دستور میں ڈھالنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے آئینی دفعات کو فریب دینے اور دھوکہ دہی کے لیے استعمال کیا، اقتدار و اختیار ان سے چھین لیا جائے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے اس کلب کو توڑ کر باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دی جائے جو دستور کے مطابق ملک کا نظام بنانے، چلانے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کے لیے تیار و آمادہ ہوں۔ یہ کام جماعت اسلامی اپنے بے لوث اور مخلص کارکنوں کی مدد سے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور وہی قوم کو بڑی جدوجہد کے لیے آمادہ کر سکتی ہے۔

عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اس تحریک میں جماعت اسلامی کے علاوہ اور کون کون سی جماعتیں شامل ہیں۔ یہ سوال دراصل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ قوم مستقل طور پر گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کے برعکس قوم کی بڑی تعداد موجودہ جماعتوں، گروہوں اور فرقوں

سے الگ اور بیزار ہے۔ ان لوگوں کو اگر ایک عظیم اصلاحی تحریک برپا کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے تو بے غرض اور مخلص لوگ جو موجودہ گروہ بندیوں سے وابستہ ہیں وہ بھی آزاد ہو کر اس تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ دینی اور مذہبی جماعتوں سے وابستہ افراد بھی مسلکی عصبیت اور فقہی تنکنائیوں سے نکل کر اُمت کے اجتماعی مفاد کی خاطر کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ علمائے کرام ائمہ اور خطیب حضرات کی بہت بڑی تعداد بھی ان شاء اللہ اس کام میں مدد و معاون ثابت ہوگی۔

جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے حالیہ اجلاس میں اس طرح کی تحریک چلانے کا اصولی فیصلہ کر لیا گیا ہے لیکن اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے مناسب تیاری اور معاشرے کے تمام نیک دل افراد اور اصحابِ عظمت کو ساتھ ملانے کے لیے ہم سب کو اپنے اپنے حصے کا کام کرنا ہوگا۔ قارئین ترجمان القرآن بھی ایک ممتاز حلقہ رکھتے ہیں۔ اس میں قوم کی رہنمائی کرنے والے دانشور بھی شامل ہیں۔ اگر آپ حضرات بھی اپنے حلقے کے اندر سرگرم عمل ہو کر اس تحریک کو قوت فراہم کرنے کا بیڑا اٹھالیں تو نہ صرف بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں بلکہ عند اللہ اپنے فرض سے عہدہ برآ بھی ہو سکیں گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس بڑے کام میں شرکت کے لیے اپنے قریب ترین ذمہ دارانِ جماعت اسلامی سے رابطہ کریں اور اپنی خدمات انھیں پیش کریں۔ اگر آپ کسی گاؤں میں رہتے ہیں تو گاؤں کے لوگوں کو جمع کریں، شہر میں رہتے ہیں تو محلے کے لوگوں کو اکٹھا کر کے اس کام میں حصہ لینے پر آمادہ کریں۔ جس مسجد میں نماز پڑھتے ہیں اس کے امام اور نمازیوں کو اس کام کے مشورے میں شریک کریں۔ آپ یقین جانیں یہ وہ کام ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء اور پیغمبر آخرا الزماں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، اسی کام کے لیے یہ اُمت مبعوث کی گئی اور اُمتِ مسلمہ کو اسی کام پر اکٹھا کرنے کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا۔

آج پاکستان کے حالات کتنے ہی دگرگوں کیوں نہ ہوں، عوام کے اندر ان کا شعور اور بیداری ہمارا حقیقی سرمایہ اور اُمید کا پیغام ہے۔ ملک کے اصل دشمن وہ ہیں جو مایوس ہیں اور مایوسی پھیلاتے ہیں۔ تاریخ میں ایسی قوموں کی مثالیں کم نہیں جو زوال کے بعد عروج کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھیں، جدوجہد کریں تو یقیناً اللہ کی مدد آئے گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے رستے میں نکلنے والوں کو رستہ بھی دکھاتا ہے اور ان کی مدد بھی کرتا ہے۔ آج کے پاکستان کا اور ہماری آنے والی نسلوں کا ہم سے یہ تقاضا ہے کہ ہم خود غرضی اور ذاتی مفادات کی روش ترک کر کے اعلیٰ مقاصد کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ یہی میرا آپ کے لیے پیغام ہے یہی ملک کے ہر خیر خواہ کا مقدس ترین فریضہ ہے۔

(جنوری ۱۹۹۹ء)



## اسلامی تحریکیں — خدشات اور امکانات

کیا دنیا کے مختلف حصوں میں اُٹھنے والی اسلامی تحریکیں کسی خطرے کی علامت ہیں؟ وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ان تحریکوں کو کچل دیا جائے؟ کیا ان تحریکوں سے صرف غیر مسلم مغرب ہی خائف ہے یا مشرق کو بھی ان سے کوئی خطرہ درپیش ہے؟

یہ سوالات بہت اہمیت کے حامل ہیں لیکن ان کا کوئی بھی جواب دینے سے پہلے میں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ”اسلامی تحریک“ سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نکتے کی وضاحت سے اس بے بنیاد خوف کی اصلیت بھی واضح ہو جائے گی جو مغرب اسلام سے خواہ مخواہ ہی محسوس کر رہا ہے۔

تحریک اسلامی کی بنیاد قرآن اور اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ عملی نمونہ زندگی پر قائم ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس کائنات کی بنیاد عدل و قسط کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ کائنات کامل ہے، ہر قسم کے نقص سے پاک ہے، اس کے اجزائیں ہم آہنگی ہے اور اس کا ہر عنصر کسی دوسرے عنصر کی تکمیل کرتا ہے۔ اسی وجہ سے نہ صرف یہ کہ زندگی قائم رہتی ہے بلکہ ہر لمحے ترقی کی طرف مائل ہے۔

اس بنیادی اصول کے حوالے سے ایک اسلامی تحریک کا مقصد عدل و قسط کا حصول اور معاشرتی و اخلاقی طور پر انصاف کا قیام ہے۔ انصاف کے قائم ہونے یا نہ ہونے کا ہماری

زندگی سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ انصاف کے قیام کا منطقی نتیجہ امن، سکون اور احساس تحفظ ہوتا ہے جبکہ اس کے نہ ہونے کی صورت میں انسانی معاشرہ افراتفری، تصادم اور قتل و غارت کا شکار ہوتا ہے۔ اسلامی نظامِ عدل اگر مسلمانوں کے لیے ہے تو بقیہ دنیا کے لیے بھی ہے بالفاظِ دیگر اسلامی تحریک اپنے شانوں پر دو چہرے سجائے نہیں پھرتی، اس کے دو مختلف لائحہ عمل نہیں کہ مسلمانوں کے لیے تو وہ عدل و انصاف کے لیے کوشاں ہو اور غیر مسلموں کے لیے انتشار اور افراتفری کو روار کھے۔ اسلامی تحریک تو ہر ایک کے لیے انصاف کی خواہاں ہے تاکہ یہ کرۂ ارض ایک بہتر زندگی گزارنے کے لیے مناسب مقام بن سکے۔ اہل مغرب صرف اپنے لیے امن و امان چاہتے ہیں جبکہ دوسروں کے لیے دائمی انتشار چاہتے ہیں۔

اسلامی تحریک اخلاقی ضوابط کی پابند ہوتی ہے۔ وہ افراد کو بیرونی ضابطوں اور ریاستی جبر سے خیر کی طرف راغب نہیں کرتی بلکہ انسان کے اندر نیکی کی جو صلاحیت ہے اسے نشوونما دے کر فرد کی اس سطح پر لے آتی ہے کہ وہ کسی خارجی محرک کے بغیر خود اپنا احتساب کرے اور اس طرح کے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر ایسا معاشرہ بنائے جس میں خیر و فلاح کا دور دورہ ہو۔ حد سے زیادہ قانونی ضابطے، غیر ضروری حکومتی ادارے اور بے تحاشہ ریاستی اخراجات لادین سیکولر معاشروں کا خاصہ ہیں، اسلام ان سے اجتناب کرتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے ان امکانات کی تکمیل بھی نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اسے ودیعت کیے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے اسلامی تحریک یہ ضروری سمجھتی ہے کہ بے حس اور بے محابہ مادیت، جنسی بے راہ روی اور اشیائے نعیش کی بے قید خواہشات کو اعتدال میں لایا جائے کیونکہ یہ تینوں موجودہ زمانے میں جرائم، عدل تحفظ اور خوف کا باعث ہیں۔ مغرب اپنی فطرت کے ان اجزائے ترکیبی کو نہ صرف برقرار رکھنا چاہتا ہے بلکہ انھیں دوسروں پر مسلط بھی کرنا چاہتا ہے۔

اسلامی تحریک عقل و دانش کی اہمیت میں یقین رکھتی ہے لیکن یہ یقین آزاد عقلیت پرستی پر منتج نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے اسلام کے اساسی اصولوں پر استوار کرنا چاہتی ہے۔ ہم زندگی کے ہر طرح کے معاملات میں وحی الہی کے اہم ترین کردار پر زور دیتے ہیں کیونکہ ایک حقیقی مابعد الطبیعیاتی بنیاد کی عدم موجودگی میں عقل ہدایت کا راستہ نہیں دکھاتی بلکہ ہولناک نتائج تک پہنچاتی ہے۔ اس کے برعکس مغرب عقل کو عقائد، تاریخ اور سماجی قدروں سے بالا رکھنا چاہتا ہے۔

اسلامی تحریک اس امر میں بھی یقین رکھتی ہے کہ انسانی کردار کے دو پہلو ہیں، یعنی اس کی فطرت روح اور مادہ سے عبارت ہے اور اس کے ارتقا اور تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک مربوط اور جامع ترقیاتی ماڈل فراہم کیا جائے۔

ایسا نظام جو روحانی ضروریات کو نظر انداز کرے اور مادی ضروریات کو ہی ساری اہمیت دے وہ ایک یکطرفہ ہے اور آخر کار ناکام ہوگا۔ یہ اصول ان مذاہب پر بھی صادق آتا ہے جو مادی تقاضوں کی قیمت پر روحانی قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اہل مغرب بالعموم انسانی فطرت کے روحانی پہلو کو اہمیت نہیں دیتے، اور سیکولر ازم کو ہی واحد طرز زندگی قرار دیتے ہیں۔

ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اسلام ایک طرزِ حیات ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے اپنا زاویہ فکر رکھتا ہے۔ مغرب اور ان کی فکر سے متاثر ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس کی تعبیریوں کرتا ہے کہ اسلام ایک ”محدود مذہب“ ہے، یہ ایک استبدادی حکومت بناتا ہے جو لوگوں پر ایک خاص قسم کی ریاستی فکر مسلط کر دے گا اور دوسری تعبیرات یا ذہنی رویے اختیار نہیں کیے جاسکیں گے۔ یہ بالکل غلط بات ہے کیونکہ اسلام نہ تو ”محدود مذہب“ ہے نہ ہی ایک جبری نظام ہے جو حکمت اور صبر سے عاری



ہو۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ ایک نظریہ حیات ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ بنیادی تصورات دیتا ہے اور دنیا کے ہر کچھر کے لوگ ان اصولوں سے مطابقت رکھنے والے امور کو اختیار کر کے زندگی گزار سکتے ہیں۔ ایسا کوئی تاثر کہ اسلام ایک کلیت پرست ریاست بناتا ہے جو چھوٹی چھوٹی جزئیات تک اپنے شہریوں کے لیے طے کرے بے بنیاد ہے۔ میں اسے ایک ناروا پابندی سمجھتا ہوں کہ لوگوں کے جمالیاتی ذوق اور ان کی اس فطری طلب میں کہ وہ جس شے کو اپنے لیے بہتر سمجھیں اس کا انتخاب کریں مداخلت کی جائے۔ اسلام جبر کے خلاف ہے۔ ہم محض قانون کو ہی تبدیلی کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ ہم اخلاقی اقدار اور انسانی ضمیر کو معاشرتی تبدیلی کا اہم ترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں پاپائیت نہیں۔ ہم اختلاف رائے کو رحمت سمجھتے ہیں اور ہر ایک کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اسلام کی واضح حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی فکر کے مطابق جو درست سمجھے اسے اختیار کرے۔

اسلامی حکومت کوئی بلڈ و زرقم کی شے نہیں جو ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دے اور انسانوں کے جسم اور روح پر ایک فولادی جیکٹ چڑھا دے۔ اسلامی حکومت تو اختلاف اور تنوع کو تسلیم کرتے ہوئے عوام الناس کو متحرک کرتی ہے کہ سب ہم نوا ہو کر ایک خوبصورت نغمے کی شکل اختیار کر لیں۔ اسلام جیسا کہ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے لوگوں کو رواج اور رسومات کے غیر ضروری بوجھ سے آزادی دلاتا ہے ان کی زنجیروں کو کاٹتا ہے اور انھیں جہالت اور جامد ذہنی رویوں سے نجات دلاتا ہے تاکہ وہ اپنا حق زندگی اسلام کے اندر رہتے ہوئے استعمال کر سکیں اور اس طرح اپنے حالات اور ماحول پر غالب ہو سکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین کے متعلق فرمایا کہ یہ دین فطرت ہے۔ ہمارا بھی یہی تصور دین ہے۔ اسلام کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں اس لیے قرآن نے بار بار تدبیر و تفکر اور تعقل کی تلقین کی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اسلام دشمن قوتیں اسلامی تحریک سے کیوں خائف ہیں۔ اس کی

وجوہات بڑی نمایاں اور عام فہم ہیں۔

اسلامی تحریک مغرب کے سیکولر ماڈل کو مسترد کرتی ہے جو فرانس فوکویاما (Francis Fukuyama) کے الفاظ میں ”انسانیت کے نظریاتی ارتقا کی معراج ہے اور مغربی لبرل جمہوریت کی عالمی حقیقت کی صورت میں انسانوں کی تشکیل کردہ حکومت کی کامل شکل ہے۔“

اسلامی تحریک کا مغربی نظام قبول کرنے سے انکار ایک اختلاف رائے کا عام مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس طرح ہم اپنے انسانی جوہر کا اثبات کرتے ہیں۔ ہم اپنی تقدیر کے خود مالک بننا چاہتے ہیں۔ ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا مغرب کا کہ ہم اپنے لیے جس راہ کا چاہیں انتخاب کریں۔ مسلمان نہیں چاہتے کہ ان کی تحقیر کی جائے اور ہر بات پر انہیں ذلت برداشت کرنی پڑے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے قوانین اور اداروں کے ذریعے خود حکومت کریں۔ اسلامی تحریک کی یہ خواہش کہ مسلمان اپنی تقدیر کے خود مالک بنیں، مغرب کے نزدیک ان کی تہذیب کے لیے حقیقی خطرہ ہے جو ان کے عالمی غلبے اور تسلط کا خواب پریشان کر سکتی ہے۔ طاقت اور غلبے کی نفسیات میں یہ بات شامل ہے کہ اگر انحراف اور بغاوت کے اظہار پر سزا و تعزیر نہ دی جائے اور مخالف تہذیبی فکر کا راستہ نہ روکا جائے تو اس سے غالب تہذیب کی بقا کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ان کے اختتام کی ابتدا بن جائے۔

اسلامی تحریک خود انحصاری پر یقین رکھتی ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بابرکت ذات کی پرستش کرنے والے دنیا میں مانگنے کے لیے نہیں بلکہ دینے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں اپنی کارکردگی، مہارت اور انتظامی صلاحیتوں میں بہترین ہونا چاہیے تاکہ وہ اسلامی نظام کی برتری دنیا پر ثابت کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی چاہتے ہیں

کہ ہماری حق تلفی نہ ہو اور دنیا ہم سے انصاف کرے۔ اصولی طور پر تو مغرب کو مسلمانوں کی محض اس خواہش سے کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ اسلامی تحریک کا یہ اصرار کہ مسلمانانِ عالم کو آبرو مندانہ زندگی کا موقع ملے، مغرب کے لیے بنیادی مسئلہ بن گیا ہے۔

در اصل مغربی ممالک دولت کو طاقت، تحفظ اور خوشی کا منبع سمجھتے ہیں۔ دولت کے حصول کے لیے ستا خام مال اور اس کے بعد تیار شدہ اشیاء کی کھپت کے لیے مارکیٹ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ اس وقت کل دنیا کی آبادی کا 5.6 فیصد ہے جبکہ دنیا کے بنیادی وسائل کا ۴۰ فیصد امریکی عوام خرچ کرتے ہیں اور اگر وسائل کے اس انتہائی تصرف و استحصال میں دوسرے مغربی ممالک اور روس کو بھی شامل کر لیا جائے تو باقی تمام دنیا کے لیے محض ۱۵ سے ۲۰ فیصد تک بچتا ہے۔ عالمی وسائل کے اس طرح کے بے جا استعمال نے مغرب میں ایک خطرناک ”بیمار ذہن“ پیدا کر دیا ہے جو برطانوی کردار پر جارج برنارڈ شا کے تبصرے میں خوب اچھی طرح بیان ہوا ہے۔

”ایک انگریز غلط یا صحیح کوئی بھی کام کرے لیکن وہ کبھی غلطی پر نہیں ہوتا۔ وہ (انگریز) آپ سے حب الوطنی کے اصولوں پر جنگ کرتا ہے، کاروبار کے اصولوں پر آپ کو لوٹتا ہے اور سامراجیت کے اصولوں پر آپ کو غلام بنا لیتا ہے۔“

مندرجہ بالا رائے نہ صرف انگریز بلکہ تمام مغربی دنیا پر بالعموم صادق آتی ہے۔ مورخ پال جانسن (Paul Johnson) مغرب کے اسی رویے کو طاقت اور غلبے کی ایک زبردست خواہش قرار دیتے ہیں۔ ان کے بقول یہ ذہنی کیفیت ایک لادینی نظام میں تباہ کن صورت اختیار کر جاتی ہے۔ امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم اس وقت گرایا جب



جنگ کے شعلے تقریباً سرد پڑ چکے تھے۔ اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ وہ جاپان کو مثالی سزا دے کر پوری دنیا پر اپنی دھاک بٹھا دے۔ اسی روش کو جاری رکھتے ہوئے امریکہ نے ابھی تک عراق کا گھیراؤ کیا ہوا ہے اور بتدریج اس کو مکمل تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے جبکہ عراق کویت جنگ کبھی کی ختم ہو چکی ہے۔

### اسلام کے خلاف سازشیں:

مغرب کے خوف کی یہ نوعیت اور دوسروں کی دولت اور وسائل کی بنیاد پر اپنی جھوٹی خوشحالی کو قائم رکھنے کی یہ شدید خواہش، اسے مسلمانوں کے اور ان کی حقیقی قیادت کے بارے میں مختلف قسم کی ریشہ دوانیوں میں مصروف رکھتی ہے:

اول، مغرب کی اسلامی تہذیب و ثقافت کے خلاف مسلسل یورش کہ ایک ”فرسودہ“ اور ”ازمنہ قدیم“ نظریہ حیات ہے جو مخصوص سماجی و معاشی حالات اور تاریخ کے ایک خاص دور کی پیداوار ہے۔

دوم، ٹیلی ویژن پروگرام، کتابوں، رسائل اور اخبارات کی مدد سے ایک اطلاعاتی ماحول کے ذریعے سیکولر ذہن بنانا جو مغرب کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہو۔

سوم، ایک ایسے تعلیم یافتہ گروہ کی تشکیل جو مغرب کو اپنے لیے ماڈل سمجھے اور اس طرح خود اپنے معاشرے اور اس کی اخلاقی قدروں کے خلاف صف آراء ہو جائے۔

چہارم، قدروں سے آزاد ایک ایسے لبرل تعلیمی نظام کی تشکیل کی حوصلہ افزائی جس کے نتیجے میں مسلمان معاشرے کو مغرب میں ضم کیا جاسکے۔

پنجم، مسلمان معاشروں میں کٹھ پتلی حکومتوں کی تشکیل جن کے ذریعے اسلامی تحریکوں کا سد باب بھی کیا جائے اور ساتھ ہی مسلم عوام کو غربت و افلاس میں ہمیشہ کے لیے مبتلا رکھا جاسکے۔ آخر الذکر مقصد کے حصول کے لیے مغرب عالمی جنگ اور آئی ایم ایف کو استعمال

کرتا ہے۔ پروفیسر چامسکی (Chomsky) جو خود امریکی شہری ہیں، اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ”آئی ایم ایف کی شرائط جو آزاد مارکیٹ معیشت کا مطالبہ کرتی ہیں خوراک پر زرتلائی (سبسڈی) اور مقامی صنعتوں کے تحفظ کی مخالفت کرتی ہیں۔ یہ طریقہ کار اس امر کا ضامن ہے کہ اہل ثروت اور مراعات یافتہ افراد ہی اس (جمہوری) تماشے کو چلائیں اور دو سطحی معاشروں کو برقرار رکھیں جو (مغرب کے لیے) از بس ضروری ہے۔“ ایک اور تدبیر جسے اہل مغرب نے تجربات کے بعد سائنس کی شکل دی ہے وہ قرضہ جات کی فراہمی اور مقامی کرنسیوں کا اس طرح سے انتظام و انصرام ہے کہ ڈالر کے لیے مصنوعی قلت پیدا کی جا سکے۔ مثلاً ۱۳۰ ارب ڈالر کا ایک آزاد متحرک فنڈ تشکیل دیا گیا ہے جو کسی ملک تک محدود نہیں۔ اس فنڈ کو جوئے کی رقم (Casino Money) کہا جاتا ہے۔ اس کے توسط سے شاک مارکیٹوں میں سرمایہ کاری کر کے شاک کی قیمتوں میں مصنوعی تیزی پیدا کی جاتی ہے اور اس طرح سے مارکیٹ میں اُبال لا کر سرمایے کو نکال لیا جاتا ہے۔

ششم، جہاں تعذیب و تعزیر اسلامی تحریک کو روک نہ سکے وہاں یہ کوشش کی جائے کہ ان کی قیادت کے خلاف گندگی اُچھالنے کی مہم کو تسلسل سے جاری رکھا جائے جس کے نتیجے میں اسے ”نااہل“، ”متروک“، ”بے مغز عقیدہ پرست“، ”رجعت پسند“ اور ”تاریک خیال“ ثابت کیا جاسکے۔

اس مسلسل کشمکش میں مغرب کے آلہ کار حکمران اور سیکولر حضرات کا اسلامی قوتوں کے خلاف ایک فطری الحاق بنتا ہے۔ ماضی میں الجزائر اور دیگر ممالک میں اسلامی تحریک کے ظہور و عروج کے پس منظر میں ایک نئی حکمت عملی وضع کی جا رہی ہے جس کے خدوخال درج ذیل ہیں:

☆ اسلامی تحریکوں کے خلاف کھلم کھلا جارحیت کا ارتکاب نہ کیا جائے کیونکہ اس پر ردِ عمل

سے ان کی اپیل میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔

☆ اسلام کو نمائشی سطح پر اختیار کر لیا جائے۔ کھپتلی حکومتیں عبادات اور رسومات پر زور دیں۔ یہ سب کچھ ٹیلی ویژن کی روشنی میں کیا جاتا ہے تاکہ حکمرانوں کی اسلامی دوستی کا تاثر مسلم عوام کو دیا جاسکے۔ ساتھ ہی ٹی وی پر ”بے روح“ مذہبی پروگرام تسلسل سے پیش کیے جائیں۔

☆ مسلمان عوام کی اسلام سے محبت کو کم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسلامی قوتوں کو حکومت میں شامل کیا جائے اور یہ اہتمام کیا جائے کہ وہ مروجہ نظام کے اندر رہ کر کام کریں۔ اس طرح عوام میں ان کی نااہلیت ثابت کی جاسکے گی۔ مزید برآں مروجہ نظام میں کام کرتے ہوئے ان کے اعلیٰ اصول، عملی تقاضوں کی تاب نہ لا کر اپنی کشش کھودیں گے۔

☆ جب وہ ایک دفعہ مروجہ نظام کا حصہ بن جائیں گے تو پھر ان کی منفرد حیثیت باقی نہ رہے گی بلکہ دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح کی کمزوریاں بلکہ انہی کی مالی بد معاملگی اور کرپشن بھی ان میں در آئیں گی۔

☆ مغرب اپنی ایجنٹ حکومت کے لیے یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے عوام کو اچھی اور ذمہ دار حکومت دیں تاکہ ملک میں ایسے حالات نہ رہیں جو اسلامی تحریکوں کے برگ و بار لانے کے لیے سازگار ہوں۔

مغرب اور ان کے گماشتوں کی ان سازشوں کے باوجود اسلامی تحریک اپنے آپ کو عوام سے وابستہ کرتے ہوئے اسلامی تبدیلی کے عمل کو تیز تر کرے گی۔ یہ ہمارا اپنے رب سے اپنے عوام سے اور اپنی تاریخ سے وعدہ ہے۔ سیکولر حضرات ہماری تاریخ کی مذمت کرتے ہیں لیکن اسی تاریخ سے ہماری ملی زندگی کا اثبات ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی



ہے کہ دوسرے تو تاریخ کو پارینہ واقعات کا مجموعہ تصور کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے تو یہ میزانِ عمل اور تعزیر ہے۔ یہ نہ صرف ہماری ماضی کی کامرانیوں کی عکاسی کرتی ہے بلکہ ہمیں اپنے حال کی ناکامیاں بھی دکھاتی ہے۔ اسلامی ریاست کی عدم موجودگی میں ایک مسلمان کی زندگی کرب انگیز ہوتی ہے۔ اس کا احساسِ ذلت شدید اور اس کی روح کا زخم گہرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نو جوان نسل صورت حال کی سنگینی کو انگیز کرتے ہوئے خلافت کے احیا کے لیے سرفروشی کا مظاہرہ کرتی رہے گی، ایک ایسی جدید ریاست کے قیام کے لیے جو نہ تو اپنے ماضی پر شرمندہ ہوگی اور نہ ہم عصر تقاضوں سے گریز کی راہ اختیار کرے گی۔ وہ اسن و سلامتی، عزت و سربلندی اور کامیابی و خوش حالی کی نقیب ہوگی۔

(اکتوبر ۱۹۹۸ء)

## سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام

ایک روایت کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر کہا ”اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے موجود تھے، لیکن ہمیں ان سے آشنا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ حضور کی وجہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی معرفت ملی۔“

حضور نبی کریم کو اسی لیے رحمت دو عالم اور محسن انسانیت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ انسانیت کے لیے بے شمار نعمتیں لے کر آئے۔ معرفت الہی، اخوت و محبت اور وحدت آدم کا درس لائے۔ رنگ و نسل کے امتیازات ختم کرنے آئے۔ انسانیت کو ایک لڑی میں پروانے کے لیے تشریف لائے۔ دنیا کو جنت کا نمونہ بنانے کا قرینہ سکھانے اور آخرت میں جنت کے حصول اور دوزخ سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ بنانے کے لیے تشریف لائے۔ وہ لوگ جنہیں ہدایت ملی، ان پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پناہ احسانات ہیں۔ اسی لیے حضور پر کثرت سے درود و سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ کہا گیا ”اللہ اور اس کے فرشتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجا کرو“ آپ کے ساتھ محبت ایمان کا تقاضا بتایا گیا۔ آپ کی کامل اتباع کو ایمان کے لیے ضروری شرط ٹھہرایا گیا۔ لازم ٹھہرا کہ محض آپ سے تعلق خاطر ہی نہ ہو بلکہ عشق و محبت ہو۔ ایسا عشق اور ایسی محبت کہ آپ کی ہر ادا محبوب اور ہر طریقہ مطلوب ہو۔ اس لیے کہ سچی محبت ہو تو پھر انسان محبوب کی طرح بننے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور نبی کریم نے خود اپنے ساتھ محبت کی یوں تعلیم فرمائی:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ  
أَجْمَعِينَ ۝

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے  
اپنے والد اپنی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“

یہ محبت دنیا کی عام محبتوں پر یہ فضیلت رکھتی ہے کہ اس کے بغیر ایمان ہی مکمل نہیں  
ہوتا، یہ شرط ایمان ہے۔ اس محبت کی بے پناہی اور اس محبوب کی رفعت شان کا کیا ٹھکانا کہ  
حضور کو خود اللہ رب العالمین نے اپنے ساتھ محبوب و مطلوب کائنات قرار دیا ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ  
وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكَنٌ  
تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ  
فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝

(التوبہ ۹: ۲۴)

”اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور  
تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے  
ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے  
وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے  
عزیز تر ہیں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے  
اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔“

اس آیت ربانی میں اللہ کی محبت، رسول اللہ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کا  
ایک ساتھ ذکر ہے۔ یعنی یہ تین محبتیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ دراصل یہ تینوں محبتیں ایک



۲۴۳ — مضامین قاضی حسین احمد

ہیں اور ان کی وحدت و یک جائی کے بغیر انسانیت کی وحدت اور امت کی شیرازہ بندی نہیں ہو سکتی۔ اللہ سے محبت نہیں ہو سکتی اگر رسول اللہ سے محبت نہ ہو اور رسول اللہ کی محبت کوئی مفہوم نہیں رکھتی اگر جہاد فی سبیل اللہ سے محبت نہیں یعنی جہد و عمل سے زندگی گزارنے کی تمنا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رفیع الشان مرتبہ

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الم نشرح ۹۳:۴)

”اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آواز بلند کر دیا“ سے واضح کیا۔ اہل ایمان کو آپ سے محبت کا قرینہ بھی خود اللہ رب العالمین نے سکھایا۔ ذرا اس رفعت و عظمت کو تصور میں لائیے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ

سَمِيعٌ عَلِيمٌ (الحجرات ۱:۴۹)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔“

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند آواز میں بات کرنے سے بھی منع کر دیا گیا:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا

تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ

وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ (الحجرات ۲:۴۹)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے

کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کر یا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور عاجزی اور نرمی سے بات کرنے والوں کی یوں تحسین کی گئی:

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

(الحجرات ۴۹:۳)

”جو رسول خدا کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجرات کے باہر سے پکارنے والوں کو یوں خبردار کیا گیا:

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (الحجرات ۴۹:۳)

”اے نبی جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔“

حضور نبی کریم کی مجلس کے آداب ان کے بعد آنے والے مسلمانوں کے لیے بھی یہی ہیں کہ حضور کی حدودِ ادب اور حدودِ اطاعت ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہیں۔ ان سے آگے نہ بڑھیں ان کا اتباع اور اطاعت کریں اور جس مجلس میں حضور کا ذکر ہو رہا ہو ان کی احادیث بیان ہو رہی ہوں ان کی سیرت بیان کی جا رہی ہو اس میں بلند آواز سے نہ بولیں آپ کے مبارک قول سے اپنی بات کو زیادہ وقعت نہ دیں اور کوئی کام کرتے ہوئے یہ ضرور دیکھیں کہ اس سلسلے میں حضور کا مبارک عمل کیا اور کیسا تھا۔ جہاں حضور کا کوئی قول و فعل سامنے آ جائے

وہاں اپنے فیصلے کو ترک کر دیں، اپنی مرضی کو چھوڑ دیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا

يَجِدُوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيْمًا O (النساء: ۶۵)

”نہیں، اے محمد! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ

اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ

کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسرتسلیم کر لیں۔“

محبوب کی بات سن کر اس پر سرتسلیم خم کرنا تو راحت جاں ہوتا ہے، اس سے دل میں تنگی

کہاں ہوتی ہے۔ حضور کی اطاعت سے دل میں تنگی محسوس ہو یا آپ کا فیصلہ گراں گزرے، تو

سمجھ لینا چاہیے کہ محبت کا دعویٰ خام ہے۔ حضور کی محبت ایک بہت بڑا خزانہ ہے اور اللہ تعالیٰ

نے مسلمانوں کے دلوں کو اس خزانے سے بھر دیا ہے۔ اسی عشق و محبت کی وجہ سے امت کی

شیرازہ بندی ہوئی اور مسلمان اتحاد کی نعمتوں سے فیضیاب ہوئے۔ مصلحین امت کے لیے

آج بھی محبت رسول ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ اس کے ذریعے مسلمانوں کو اتباع و

اطاعت رسول کے لیے بلائیں، انھیں ایک لڑی میں پروئیں اور ان کو احساس دلائیں کہ نمائشی

محبت کے بجائے اس محبت کے اصل تقاضے کو سمجھیں، یہ جان لیں کہ یہ محبت ہم سے کن

قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے؟ خود حضور نے فرمایا ”تم میں سے اس وقت تک کوئی مومن نہیں

ہو سکتا جب تک اس کی ہر خواہش میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے۔“ آپ نے

یہ نہیں فرمایا کہ ہر خواہش نفس کو ترک کر دو، بلکہ اسے اپنی شریعت کے تابع کرنے کا حکم فرمایا

ہے۔

قرآن آپ کی تشریف آوری کو مومنین پر احسان عظیم قرار دیتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رُسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا



عَلَيْهِمْ اِيْتِه وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ  
قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آل عمران ۱۶۳)

”درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔“

اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کو محسوس کرنا چاہیے اور یہ بھی جان لینا چاہیے کہ حضور کا وہ مشن جس کی تکمیل آج بھی ہمارا فرض ہے، یہ تھا کہ حضور اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے تھے، مسلمانوں کا تزکیہ کرتے تھے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا دین سکھانے کے لیے بھیجا تھا۔ ان سے کہا تھا کہ وہ انسانوں کو اللہ کی پہچان کرا دیں، اس کی بندگی سکھا دیں، انہیں آپس میں مل جل کر رہنے کے طریقے سکھا دیں۔ یہ بتا دیں کہ حقوق اللہ کیا ہیں اور حقوق العباد کیا ہیں، اخلاقِ حسنہ کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے قرآن بھیجا، اس کی تعلیم دی، حکمت بھی سکھائی اور تزکیہ بھی کیا۔ دین کی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن اور حضور کا اسوۂ حسنہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا کہ ان خلقہ القرآن (وہ قرآن کریم کا چلتا پھرتا نمونہ تھے)۔ حضور کی سیرتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ ان لوگوں کے لیے نجات کا ذریعہ ہے جو اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح چاہتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کے مدعی ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ ان سے محبت کرے، اللہ ان کو اطاعتِ رسول کا حکم دیتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تَحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳: ۳۱)

”اے نبی! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو

میری پیروی اختیار کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔“

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ

وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (الاحزاب ۲۱:۳۳)

”درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس

شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد

کرے۔“

بے شک بعثت نبویؐ کا مقصد دین سکھانا، اس کی تعلیم دینا، اخلاق لکھانا اور حکمت سکھانا بھی ہے مگر یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ آپؐ اس دین کو محض سکھانے کے لیے ہی نہیں آئے تھے بلکہ اسے غالب کرنے کے لیے بھی تشریف لائے۔ چنانچہ آج بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اہم ترین تقاضا اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ جو آپؐ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، جو آپؐ کی سنت کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، ان کو آپؐ کا ہر انداز محبوب ہونا چاہیے۔ ہر ادا کی پیروی کرنی چاہیے۔ آپؐ معلم و مربی اور مزکی بھی ہیں اور فاتح و سالار بھی، مجاہد بھی اور شہادت کے آرزو مند بھی۔ آپؐ جس دین کو سکھانے کے لیے تشریف لائے تھے اسے دنیا میں غالب کرنے کے لیے بھی تشریف لائے تھے اور اس کی خاطر آپؐ نے پتھر بھی کھائے اور آپؐ کے دندان مبارک بھی شہید ہوئے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ

كُلِّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا (الفتح ۲۸:۲۸)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ

اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے محض اس بات کی تصدیق نہیں کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ بلکہ اس بات کے لیے بھی اپنی گواہی پیش کی ہے کہ آپؐ نے اپنے قول و فعل سے ثابت کیا ہے کہ اللہ کا دین دنیا میں غالب ہونے اور غالب رہنے کے لیے آیا ہے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے نام لیواؤں کا فرض ہے کہ اس دین کو دوسرے نظاموں اور مذاہب پر غالب کر دیں اور جب تک یہ غالب نہیں ہو جاتا چین سے نہ بیٹھیں۔ اللہ کے دین کی حقانیت ثابت کرنے اور اسے دنیا کا غالب نظام بنانے کے طریقے بھی سکھائے گئے ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر نام لیوا کو آپؐ کے طریق کار پر چلنا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دوسروں کے طے کردہ طریقوں یا اپنے پسندیدہ طریقوں کے بجائے اللہ کے طریقے کی دعوت دیں۔ جو لوگ تمہاری طرف آئیں۔ جو لوگ اللہ کے دین کے سپاہی بنیں اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت کریں ان کا تزکیہ کریں ان کے اندر صبر و اطاعت کا جذبہ پیدا کریں ان کے اندر مشاورت کی اہمیت پیدا کریں پھر انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے کر ان کی تنظیم کریں اور پھر اس پوری جماعت کو اظہارِ دین کے کام پر لگا دیں تاکہ اقامتِ دین اور غلبہٴ دین ہو سکے۔ حضورؐ نے عملاً پوری جماعت کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام پر لگا کر دکھا دیا۔ اب یہ حضورؐ کی امت کا فریضہ ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران ۱۱۰)

”اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بُدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“



اس طرح مختلف آیات اور مختلف طریقوں سے یہ سمجھایا اور بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کام کے لیے منتخب کیا ہے کہ تم سب اللہ سے جڑ جاؤ، اللہ کی اطاعت کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، تمہیں ایک بڑے فریضے کی انجام دہی کے لیے منتخب کیا گیا ہے، تمہیں اللہ کے دین کے غلبے کے لیے کام کرنے کے لیے چنا گیا ہے۔ یہ کام سخت جاں فشانی مانگتا ہے، جان و مال کی قربانی چاہتا ہے، یہ پھولوں کا نہیں کانٹوں کا بستر ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۝ (الحج: ۲۲: ۷۸)

”اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ، اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام ”مسلم“ رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے)۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمہارا مولیٰ، بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار۔“

حضور نے ایک اُمت بنائی، اسے تعلیم و تربیت سے اس قابل کیا کہ ساری دنیا کے لیے ہدایت کا نمونہ بن سکے۔ اس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری اُمت پر گواہ بنا کر بھیجا گیا۔ اُمت کو بھی اسی طریقے پر کام کرنا چاہیے۔ انھیں دنیا کی تمام قوموں کے لیے داعی اور نمونہ بنایا گیا ہے، قیامت کے دن اُمتِ مسلمہ اقوامِ عالم پر گواہ ہوگی۔ حضور نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم حرا کی طرف آئے۔ وہ لوگوں میں آنے کے بعد حرا کی طرف نہیں گئے۔ خلوت سے داعی اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کو مجاہدے اور ریاضت سے پختہ کر دیتا ہے۔ پھر جلوت کی طرف آتا ہے اور لوگوں کو اس حسن حقیقی کا مشاہدہ کراتا ہے جس کو خود دیکھ چکا ہوتا ہے۔ حضور کو حرا میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے عشق و محبت اور معرفت کی جو دولت ملی، اسے انھوں نے اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ لوگوں کو بھی اس میں شریک کیا۔ سب سے پہلے قریبی لوگوں تک رشد و ہدایت کا پیغام پہنچانے کا حکم ملا۔

وانذر عشیرتک الاقربین (الشعراء: ۲۶: ۲۱۳)

”اپنے قریب ترین رشتے داروں کو ڈراؤ۔“

حضرت خدیجہ الکبریٰ سب سے پہلی خاتون تھیں جنہیں اس ہدایت کی روشنی سے اکتساب کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ پہلے اپنے گھروں کی طرف توجہ دیں۔ خواتین کو ساتھ ملائے بغیر ہم حضور کے کامل اتباع کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اگر دعوت و تبلیغ سے ہم خواتین کو محروم رکھیں گے تو حضور کے کامل اتباع کا تصور نامکمل رہے گا۔ بد قسمتی سے ہمارے معاشرے میں خواتین سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ خواتین کو دین کی تعلیم سے بھی محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ حضور اور صحابہ کرام کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنی ازواج کو دعوت اور تعلیم دیتے تھے۔

قُواْ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم: ۶: ۶۶)

”اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔“

اپنے گھر کے بعد آپ جس شخصیت کی طرف متوجہ ہوئے وہ آپ کے جگری دوست حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے۔ انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ ہدایت، خیر خواہی اور صحیح راستے کی طرف رہنمائی پر سب سے پہلے اپنے گھر والوں، ہمسائیوں اور دوستوں کا حق ہے۔ لوگوں

کے لیے سکول بنوانا، ہسپتال بنوانا، سڑکیں اور کنویں کھدوانا، یہ سب بھی خدمتِ خلق کے طریقے ہیں لیکن ان میں سب سے اولیٰ اور اعلیٰ خدمت یہ ہے کہ آپ کسی کو گمراہی کے راستے سے ہٹا کر ہدایت پر لے آئیں۔ اسے دین کی تعلیم دیں۔ اسے بتائیں کہ اللہ کے حقوق کیا ہیں اور بندوں کے حقوق کیا ہیں۔ پھر جس طرح حضورؐ نے اپنے اخلاقِ حسنہ سے لوگوں کو متاثر کیا، ہم بھی اسی طرح اپنے اخلاق کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارا اپنا عمل اچھا نہیں ہوگا تو ہماری زبان میں اثر بھی نہیں ہوگا۔ حضورؐ کی بنیادی تعلیم سے یہ بھی واضح ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کا پرتو اپنے اخلاق میں پیدا کرے۔ خود حضورؐ کے اخلاق پر بھی اللہ رب العالمین کے اخلاق کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ اللہ عادل ہے، حضورؐ بھی عدل کرنے والے تھے۔ اللہ رحیم ہے، حضورؐ کو بھی اللہ تعالیٰ نے خود رؤف و رحیم کہا۔ ظاہر ہے خالق اور مخلوق کی تمام چیزیں برابر نہیں ہو سکتیں، مگر بندوں کو اللہ کی صفات کا پرتو اپنے اخلاق و اعمال میں لانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جو پیغام لے کر تشریف لائے وہ کسی ایک فرد یا ایک گروہ پر نہیں، پوری امت پر فرض ہے تاہم کم از کم ایک گروہ ہر وقت ایسا رہنا چاہیے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (آل عمران ۱۰۴)

”تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں،

بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی

فلاح پائیں گے۔“

قیامت تک مسلمانوں پر حق کی طرف دعوت دینے اور برائی سے روکنے کا یہ فرض باقی



رہے گا۔ یہ فرض کسی خاص دور تک محدود نہیں۔ جس طرح اللہ نے ساری زمین کو حضورؐ اور آپؐ کی اُمت کے لیے مسجد قرار دیا ہے اسی طرح آپؐ پوری انسانیت کے لیے رحمت بنائے گئے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وسیع اور بے کراں قافلے کے سالار ہیں اور کعبہ اس کا مرکز ہے۔ یہ اُمتِ مسلمہ حضورؐ کے پیغام کو ہر زمانے اور ہر علاقے تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ حضور نبی کریمؐ کے ذریعے انسانیت تک پہنچائے گئے اس نورِ ہدایت کی تکمیل کرے گا اور اسی نے ابد تک اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرمایا ہے:

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ  
وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ (التوبة: ۳۲)

”یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔“

علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے ع

تاخدا ان يطفوا فرمودہ است

از فردن ایں چراغ آسودہ است

یہ اس نورِ ہدایت کا اعجاز ہے کہ یہ کفر کی طرف سے ڈالی جانے والی رکاوٹوں سے بے نیاز ہر لحظہ پھیلتا ہی رہتا ہے۔ آج بھی جب کہ اسلام اور مسلمانوں کو عالمِ کفر کی طرف سے بے پناہ مشکلات کا سامنا ہے، اللہ کا دین اقصائے عالم میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مشرق میں جاپان سے لے کر مغرب میں کینیڈا اور امریکہ تک انسانیت کے اندر اس کی پیاس بڑھ رہی ہے۔ سائنس کی ترقی نے دنیا کو ایک عالمی بستی (Global Village) بنا دیا ہے۔ اس عالمگیر بستی کو ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جو ساری انسانیت کے لیے عدل و

انصاف کا ضامن ہو۔ جو رحمت و محبت کا نظام ہو۔ انسانیت سن لے دیکھ لے اور مان لے کہ صرف حضور رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام ہی دنیا کو امن و سکون اور محبت و رحمت کا پیغام دے سکتا ہے۔ حضور کے دامنِ عاطفت میں آ کر ہی انسانیت کو فلاح مل سکتی ہے۔ موجودہ اضطراب سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

کل تک عالمی طاقتیں یہ دعوے کرتی تھیں کہ انہوں نے ساری طاقت حاصل کر لی ہے۔ سرد جنگ اور گرم جنگ کا خاتمہ ہونے کے بعد امریکہ نے دعویٰ کیا ہم دنیا کو انصاف اور مساوات کا نیا نظام (New World Order) دیں گے مگر چند ہی برسوں کے بعد اب وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ یہ کام ان کے بس کا نہیں۔ بھارت نے ایک دھماکہ کر کے ان کے سارے ”ورلڈ آرڈر“ کو ڈسٹرب کر دیا۔ اس عدم توازن کو ختم کرنے کے لیے پاکستان نے دھماکہ کرنا چاہا تو ساری دنیا واویلا کرنے لگی کہ پاکستان دھماکہ نہ کرے۔ دراصل پاکستان سے انہیں زیادہ خطرات ہیں اس سے ان کی مرضی کے نظام کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے کہ پاکستان مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کا علمبردار ہے۔ مغربی تہذیب کی بنیادیں کچی ہیں جبکہ اسلامی تہذیب کی بنیاد ابدی حقائق پر رکھی گئی ہے۔ اس میں نئے سرے سے ابھرنے اور نئی کونپلیس لگانے کی صلاحیت موجود ہے اور اس کے احیاء کے آثار پورے عالم میں صاف نظر آ رہے ہیں۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو دھماکہ کرنے کی توفیق عطا کر دی ہے تو مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے سارے خیالاتی محلات ٹوٹ کر رہ گئے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہو گیا کہ موجودہ جبر اور فساد کی قوتیں انسانیت کو چین اور سکون نہیں دے سکیں۔ صرف حضور کی تعلیمات کے ذریعے انسانیت کو سکھ اور چین نصیب ہو سکتا ہے۔ اب ہمیں دنیا کو یہ بتانا ہے کہ آؤ سب ہمارے حضور کے دامنِ محبت میں پناہ لے لو۔ ان کی تعلیم سے اپنے دلوں

کا زنگ اُتارو۔ تم دنیا کو نفرت اور تعصب سے نجات نہیں دلا سکتے، اس لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے اکتساب فیض کرو جہاں پوری انسانیت ایک وحدت اور ایک خاندان کی طرح ہے۔ جیسا کہ حضور کی زبان حق ترجمان سے کہلوایا گیا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا

”اے لوگو! میں تم سب کے لیے اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔“

یہ حضور ہی ہیں جنہوں نے فرمایا کہ میں نے تمام جاہلی تفاخر کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ کالے کو گورے اور گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل نہیں۔ سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اپنی حیثیت کو پہچانو اور آپس میں مل جل کر رہو۔ آپ کی تعلیم کہتی ہے کُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا ”اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ“ یہ پیغام یورپ، امریکہ اور افریقہ سمیت ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔ اغیار نے اس کا چہرہ بگاڑنے کے لیے اسے انتہا پسند دہشت گرد قرار دیا اور اس پر تنگ نظری کے الزامات عاید کیے ہیں۔ اس گمراہ کن تاثر کو ختم کرنے کے لیے بڑی محنت کرنی ہوگی۔ حضور کی زندگی کا نمونہ ہمارے پاس ہے۔ اس کے ذریعے ہم اس تصور اور تاثر کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔ حضور نے ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا تھا جنہوں نے انہیں ستایا تھا۔ انہوں نے ہمیں بھی یہی تعلیم دی ہے کہ برائی کے بدلے برائی سے پیش نہ آئیں بلکہ اچھائی سے پیش آئیں۔ یہ قرآن کا اصول ہے کہ صرف اچھائیاں ہی برائیوں کو ختم کر سکتی ہیں:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا

الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (حم السجدہ ۴۱: ۴۲)

”اور اے نبی! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو



بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔“

حکمت یہی ہے اپنا ہویا پر ایسا سب کو دل میں جگہ دینا سب کو سینے سے لگانا اور اللہ تعالیٰ کے دین کو سب کے لیے آسان بنا کر پیش کرنا زیادہ سخت نہ بنانا۔ یَسْرُوا وَلَا تَعْسِرُوا ”آسان کرو مشکل نہ بناؤ“ بَشِّرُوا وَلَا تُنْفِرُوا ”خوش خبری سناؤ“ نفرت نہ دلاؤ۔“ دین کی حکمت یہ ہے کہ اس کو بالکل سہل اور آسان بنا کر پیش کیا جائے۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مل کر اور جڑ کر رہنا چاہیے۔ رحیم و شفیق بن کر تاکہ دنیا ان کے اخلاق سے متاثر ہو۔

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (الفتح: ۲۹)

”محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔“

کفار پر سخت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں بھی کوئی کافر نظر آئے اسے زد و کوب کرنا شروع کر دیا جائے یا ان کے ساتھ ترش روئی سے پیش آیا جائے۔ کفار سے بھی حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے۔ حکم یہ ہے کہ کفر کے خلاف اپنے موقف میں سخت اور اٹل ہونا چاہیے۔ کفار کیسا بھی سخت دباؤ ڈالیں اہل ایمان حق پر ڈٹ جائیں اور باطل اور حق میں مفاہمت سے انکار کر دیں۔ ان سے سختی سے پیش آنا ضروری نہیں۔ فرقہ وارانہ اختلافات اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں۔ آپس میں تو ہمیں شیر و شکر ہونا چاہیے۔ مشترک بنیادوں کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ نسلی اور لسانی بنیادوں پر منافرت پیدا کرنا امت کو قوت سے محروم کرنے اور اتحاد امت کی جڑ کاٹنے والی بات ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اخوت اسلامی کو ”نعمت“ سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا گیا ”تم نفرتوں کی آگ کے گڑھے پر

کھڑے تھے کہ اللہ نے اپنی مہربانی سے تمہیں بچا لیا اور

فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (ال عمران ۳: ۱۰۳)

”پھر تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔“

کیسی بد قسمتی ہے کہ ہم آج اسی جاہلیت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ رحمتِ عالم پر ایمان رکھنے اور آپؐ سے محبت کے دعوے کرنے والے ایک دوسرے کے خون سے پیاس بجھا رہے ہیں۔ اس نفرت کو ختم کرنے کے لیے دنیا بھر میں اسلامی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ ان کے گرد اکٹھا ہونے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ سے قوی اُمید ہے کہ وہ مسلمانوں کے تمام گروہوں کو پھر سے شیر و شکر کر دے گا، ان کو نفرت کی آگ میں جلنے سے بچائے گا اور اپنی نعمتِ خاص سے انہیں پھر سے بھائی بھائی بنا دے گا۔ دشمنانِ اسلام کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے دامنِ رسالتؐ سے وابستگی ضروری ہے۔ ہر دور کی طرح آج بھی سیرتِ رسولؐ کا پیغام یہی ہے کہ شمعِ رسالتؐ کے پروانے رنگ و نسل اور نام و نسب کے سب بت توڑ دیں اور دینِ حق کی سر بلندی کے لیے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں ع

نہ افغانیم و نہ ترک و تیاریم

چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است

کہ ما پروردہ یک نو بہاریم

مغربی میڈیا کی کوشش ہے کہ پاکستان کے بم دھماکے کو ”اسلامی بم“ کے نام سے مشہور کروا کر ایک طرف اسلام کو (جس کے لغوی معنی امن و آشتی ہیں) بم کے نام سے

۲۵۷ — مضامین قاضی حسین احمد

وابستہ کر کے اس کے مفہوم کو بگاڑ دیا جائے اور دوسری طرف پوری غیر مسلم دنیا کو اس کے خلاف متحد کر دیا جائے حالانکہ اگر امریکہ اور یورپ کے بم ”کرسچین بم“ نہیں ہیں تو پاکستان کے بم کو کیونکر ”اسلامی بم“ کہا جاسکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مغرب کی اس سازش کو سمجھا جائے کہ وہ حضور رحمت عالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغامِ رحمت کو انسانیت کی نظروں سے چھپانے کے لیے پراپیگنڈے کا گرد و غبار اڑا رہا ہے کہ کہیں انسانیت اس دور کے تقاضوں کو سمجھ کر حضور کے دامنِ رحمت میں پناہ لینے کے لیے نہ دوڑ پڑے۔ مغرب کا یہ مطالبہ کہ صرف پانچ قوموں تک ایٹمی توانائی کو محدود رکھا جائے ایک سراسر ناجائز مطالبہ ہے۔ اگر واقعی ایٹمی ہتھیار اور دوسرے تباہ کن ہتھیاروں سے انسانیت کو محفوظ رکھنا ہے تو پانچ بڑی طاقتوں سمیت دنیا کی تمام اقوام تخفیفِ اسلحہ کے ایک معاہدے پر متفق ہو جائیں۔ بھارت نے مغربی اقوام کے دباؤ کے باوجود یہی موقف اختیار کیا ہے پاکستان کو بھی اسی اصولی موقف پر ڈٹ جانا چاہیے۔

اگر پوری دنیا میں طاقت کی زبان کے بجائے دلیل کی زبان رائج ہو جائے تو اسلام کی حقانیت لوگوں پر واضح ہو جائے گی۔ مستقبل میں ان شاء اللہ اسلام، قرآن اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن کے عام ہونے کے نتیجے میں غالب ہوگا۔ یہ اکیسویں صدی کے گلوبل ویلج (عالمی بستی) کی ضرورت ہے۔

(جولائی ۱۹۹۸ء)



## پاکستان کی دہلیز پر انقلاب کی دستک

پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر اگر ہم اس کی تاریخ پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں کہ اس عرصے میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا تو سب سے پہلے ہمیں یہ ناقابل رشک منظر نظر آتا ہے کہ وہ پاکستان جو قائد اعظمؒ کی رہنمائی میں ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں بنا تھا، دو لخت ہو چکا ہے۔ مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا ہے جو آبادی کے لحاظ سے پاکستان سے بڑا ہے۔ اسی طرح انڈونیشیا اور بھارت کے اندر بھی مسلمانوں کی آبادی پاکستان سے زیادہ ہے۔ اس طرح پاکستان نہ صرف دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک ہونے کے اعزاز سے محروم ہو چکا ہے بلکہ بچے کھچے پاکستان کا حال بھی یہ ہے کہ سخت بے یقینی کی صورت حال ہے۔ علاقائی، نسلی اور لسانی عصبيت کے ساتھ ساتھ مذہبی فرقہ واریت بھی عروج پر ہے۔ مسلمان قوم اور نظریاتی مملکت کی حیثیت سے ہم اپنی شناخت ہی قائم نہیں کر سکے اور نہ نئی نسل کے ذہنوں میں ایک اسلامی ریاست کا صحیح تشخص بٹھا سکے ہیں۔ اس کے برعکس شعوری کوشش کی جاتی رہی ہے کہ اسلام اور پاکستان کے بجائے وطنیت اور قومیت کو اجاگر کیا جائے۔ اس حقیقت کو صاف نظر انداز کر دیا گیا کہ اسلامی نظریے کو نظر انداز کرنے کے بعد ہر حوالہ مصنوعی بن جاتا ہے۔ خصوصاً وطنی قومیت تو پاکستان کا حوالہ کسی طرح بن ہی نہیں سکتی۔ پاکستان کو تو ایک وطن، ہندوستان کی تقسیم کر کے حاصل کیا گیا تھا۔ اس نظریے سے انحراف کا نتیجہ ہے کہ آج ہم پانچ بڑے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں اور مزید تقسیم در تقسیم کا

سلسلہ بھی جاری ہے۔ پاکستانی کے بجائے ہمیں پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان اور مہاجر کی نسبتیں زیادہ محبوب ہیں۔ نظریہ پاکستان سے انحراف ہی کا نتیجہ ہے کہ مہاجر قومیت کا مصنوعی نعرہ لگایا گیا، ورنہ یہ بات کون نہیں جانتا کہ مہاجر اس شخص کو کہتے ہیں جو اللہ کے دین کی خاطر اپنے وطن سے ہجرت کرے۔

وہ لوگ جو دین کی خاطر ہندوستان میں اپنے وطن، مال و دولت اور ہم زبان و ہم قبیلہ لوگوں کو چھوڑ کر آئے تھے، وہ یقیناً مہاجر تھے مگر پاکستان میں اس نظریے سے منہ موڑ لیا گیا۔ ان کے بچوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے آباؤ اجداد نے جس دین کی خاطر قربانیاں پیش کی تھیں، وہ تو موجود نہیں بلکہ وطن پرستی کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے تو انہوں نے اپنے آپ کو یہاں اجنبی محسوس کیا۔ اسی اجنبیت کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے مہاجر کا نعرہ لگایا۔ اس نعرے کے نتیجے میں وہ خود بھی مشکل میں مبتلا ہوئے اور پورے ملک کو بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہی کچھ بنگالیوں نے کیا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ پاکستان میں پاکستانی کے بجائے کوئی پنجابی، کوئی سندھی، کوئی بلوچی اور کوئی پٹھان، تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے، ہم بنگالی ہیں۔ انہوں نے ناطہ ہی توڑ لیا۔

پاکستان کا نظریاتی تشخص اُجاگر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کا نظام تعلیم نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا جاتا، ذرائع ابلاغ پاکستانیت اور اسلامیت کے فروغ کے لیے کام کرتے، مگر ان اداروں کو سیکولر طور طریقے سے چلانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ملک کی باگ ڈور برطانوی استعمار نے جن ہاتھوں کو سونپی تھی، انہوں نے استعماری طریقوں کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ دراصل برطانوی استعمار دو مقاصد لے کر یہاں آیا تھا۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ اس کی تہذیب یہاں پھیلے۔ دوسرا مقصد ایک استحصالی نظام قائم کر کے یہاں کی دولت سمیٹ کر انگلستان لے جانا تھا۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں اور ذہنی غلاموں

نے بڑی محنت اور شوق سے یہاں مغربی تہذیب کی آبیاری کی۔ تعلیمی نظام کے وہی خدوخال باقی رکھے۔ ذرائع ابلاغ کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ مختلف حیلے بہانوں سے انگریزی زبان کو بھی برقرار رکھا گیا۔ انہوں نے اردو یا علاقائی زبانوں کو ترقی دینے پر کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ ہمیشہ یہ استدلال پیش کرتے رہے کہ انگریزی تو ترقی کے لیے ایک نعمت ہے، اسے کیسے چھوڑ دیں۔ جہاں تک معاشی استحصال کا معاملہ ہے تو انگریزوں کے یہ شاگرد اپنے استادوں پر بھی بازی لے گئے۔ شاید انگریز اتنی دولت لوٹ کر اپنے ہاں منتقل نہیں کر سکا تھا جتنی دولت یہ لوٹ کر یورپ اور امریکہ لے گئے ہیں۔ اخبارات میں کئی بار یہ بات شائع ہو چکی ہے کہ ہمارے بڑے سیاستدانوں اور بیوروکریٹوں کے پچاس ارب ڈالر صرف سوئٹزر لینڈ کے بنکوں میں موجود ہیں۔

ہمارے ملک پر کل بیرونی قرض تیس ارب ڈالر ہے۔ ہم اس قرض کو اتارنے کے لیے مزید قرض لیتے ہیں۔ اس کا بڑا حصہ قرض کا سود ادا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ دولت لوٹ کر باہر لے جانے والے ہمارے پندرہ بڑے سیاستدانوں کے نام وال سٹریٹ جرنل (Wall street Journal) میں شائع ہوئے ہیں۔ ان سیاست دانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ بیرونی بنکوں میں ان سے ہر ایک کا اکاؤنٹ ایک ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ اس فہرست میں بے نظیر اور نواز شریف دونوں کے نام شامل ہیں۔ ہم نہیں کہتے کہ مذکورہ جرنل کی یہ معلومات سو فیصد درست ہے لیکن اگر یہ غلط ہیں تو ابھی تک اس اخبار کے خلاف مقدمات کیوں نہیں کیے گئے؟ امریکہ اور یورپ میں تو ایسے مقدمات پر فوری اور سخت کارروائی ہوتی ہے۔ الزام غلط ثابت ہو جائے تو بھاری جرمانے وصول کیے جاتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مقدمے اس لیے نہیں کیے کہ ان کے بڑے بڑے بنک اکاؤنٹ موجود ہیں۔ بلین ڈالر نہ سہی، کم سہی۔ یہ کھلا راز ہے کہ بیرونی ملکوں میں ان



کی دولت بھی ہے، جائیدادیں بھی ہیں۔ ان کے خاندان کے بہت سے افراد وہاں رہتے بھی ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ خود بھی وہاں جا کر مقیم ہو جاتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں جو لوگ دولت جمع کر رہے ہیں اور جو یہاں پر مغربی تہذیب کے محافظ ہیں، ان کے سرمائے کی بیرون ملک بنکوں میں حفاظت بھی کی جاتی ہے۔ ان کو کوئی خطرہ ہو تو باہر انھیں پناہ بھی مل جاتی ہے مگر اس سے ہمارا نظام اور ہماری نظریاتی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ پاکستان ایک مضبوط اسلامی نظریاتی ملک بننے کے بجائے عملی طور پر ایک کمزور اور بے سمت و منزل ملک بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں لسانی اور علاقائی تعصبات زوروں پر ہیں۔ ملک کی یک جہتی اور نظریے کی اساس پر اتحاد کی کوئی سنجیدہ کوشش کبھی نہیں کی گئی، اس سے فرقہ واریت اور مسلکی اختلاف بھی بڑھتا رہا۔ دینی تعلیم یہاں ان علماء کے ہاتھ میں ہے جو دین سے زیادہ اپنے مسلک سے محبت کرتے ہیں اور جو مشترکات کے بجائے اختلاف پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

شیعہ سنی اختلاف بہت پہلے سے چلا آ رہا تھا، جسے قتل و غارت گری تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اب تو معمولی اختلافات شدید ذاتی انتقال اور نفرت میں ڈھل گئے ہیں اور لوگوں کو بے دردی سے مسجدوں میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث کے تعصبات بھی بستی بستی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مساجد کے نام، ان کی پیشانیوں پر، مسلک کے اعتبار سے لکھے ہوتے ہیں اور اس طرح ایک اُمت واحد کو کئی گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ بقول اقبال ع ”ملتے بودی ملل گردیدہ ای“ انگریزی استعمار کے ”لڑو اور حکومت کرو“ کے اصول کے مطابق حکومت اور بیوروکریسی مذہبی طبقے کو بانٹ کر انہیں کمزور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس سے مذہبی طبقہ بدنام ہو رہا ہے اور بے اثر ہو چکا ہے۔ انتہا پسند اور جنونی لوگ بے لگام ہو چکے ہیں اور حکومت انھیں شدہ دے رہی ہے۔ قتل و غارت

گری کی جارہی ہے، مگر کسی کو سزا نہیں ملتی۔

اس صورتِ حال میں اطمینان کی واحد صورت ایسے لوگوں کا بڑی تعداد میں موجود ہونا ہے جنہیں بچے کچھے پاکستان کے بارے میں حقیقی فکر مندی ہے۔ ایک احساسِ زیاں ہے۔ میرے خیال میں قوم کے اندر یہ فکر مندی واحد صحت مند علامت ہے۔ میں نے اس احساس کا بڑے پیمانے پر ادراک کیا ہے۔ لوگ ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ کیا ہوگا اور کیا ہونا چاہیے۔ اس افراتفری اور مایوسی کے دور میں لوگوں کے اس احساس اور فکر مندی کو، میں انقلاب آفریں مرحلہ اور ایک turning point سمجھتا ہوں۔ یہ زندہ احساس اس لیے زندہ ہے کہ اگر گزشتہ نصف صدی میں ہم نے بہت کچھ کھودیا ہے تو دوسری طرف مختلف پرائیویٹ اداروں، جماعتوں اور دین کا درد رکھنے والی شخصیات کی طرف سے مثبت کوششیں بھی کی جارہی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دین کی طرف رجوع کا ایک قوی رجحان لوگوں میں موجود ہے۔ نوجوانوں میں نماز قائم کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ قرآن حفظ کرنے والوں اور تجوید سیکھنے والوں کی بڑی تعداد ہے۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کا رجحان ہے۔ جدید تعلیم کے اداروں میں بھی خاصی بڑی تعداد دینی رجحانات رکھنے والے نوجوانوں کی ہے۔ حکومت اور اس کے تمام اداروں کی طرف سے مغربیت، عریانی اور فحاشی کی سرپرستی کے باوجود عوام میں اسلام پر مٹنے والے نوجوانوں کا وجود بہت غنیمت ہے۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ بڑے پیمانے پر برائی کی تبلیغ کر رہے ہیں لیکن نوجوان نسل میں، خواتین میں، اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں برائی کے خلاف مزاحمت موجود ہے۔ اسی طرح اس عرصے میں جہاد کا جذبہ ابھرا ہے۔ نوجوانوں کی خاصی بڑی تعداد نے افغانستان اور کشمیر کے محاذوں پر داذ شجاعت دینے کے ساتھ ساتھ جانیں بھی قربان کی ہیں۔ اس سے جہادی کلچر اجاگر ہوا ہے۔ قوم میں خیر کے اس رجحان کی موجودگی کے اثر سے لوگوں میں بڑے



پیما نے پر تبدیلی کی خواہش اُبھری ہے۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں لوگوں کی عدم دلچسپی اس خواہش کی مظہر ہے۔ ہمارے اپنے اندازے کے مطابق ۲۰ فیصد لوگوں نے ووٹ ڈالے۔ حکومت نے مبالغہ آرائی کر کے کہا ۳۵ فیصد ووٹروں نے حق رائے دہی استعمال کیا۔ مبالغہ انتخابات کو کامیاب ثابت کرنے اور اعتبار پیدا کرنے کے لیے کیا گیا۔ ابھی ایران میں ۸۰ فیصد لوگوں نے ووٹ ڈالے۔ یہاں اگر ۳۵ فیصد کی شرح ہو تو بھی یہ لوگوں کی اس پورے انتخابی عمل سے مایوسی کا اظہار ہے۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ عام لوگ آئین پاکستان کی دفعہ ۶۲، ۶۳ پر عمل درآمد کی عدم موجودگی میں اور احتساب کے بغیر انتخابات کے بارے میں پہلے ہی مایوسی کا شکار ہے۔ وہ جانتے تھے کہ آئین کی ان دفعات پر عمل درآمد اور بے لاگ احتساب کے بغیر اسی قسم کا گروہ پھر برسرِ اقتدار آ جائے گا جس سے پیپلز پارٹی کی شکل میں انہوں نے بڑی مشکل سے نجات حاصل کی تھی۔

گزشتہ چار ماہ کے عرصے میں حکومت کا کردگی سے لوگوں کے یہ خدشات بڑی حد تک درست ثابت ہو گئے ہیں۔ نواز شریف کے بارے میں جو لوگوں کی تھوڑی بہت خوش فہمی تھی کہ ملک میں معاشی خوشحالی لائیں گے وہ بھی مایوسی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ حکومت نے جو بجٹ پیش کیا ہے اس میں ۱۹۵ ارب روپے کا خسارہ دکھایا گیا ہے۔ یعنی ساڑھے پانچ سو ارب کے مصارف ہیں اور آمدنی ۳۴۵ ارب روپے ہے۔ ۱۹۵ ارب روپے کا خسارہ کہاں سے پورا ہوگا؟ اگر بیرونی قرضے حاصل کریں گے تو قرضوں کی ادائیگی کا دباؤ مزید بڑھے گا۔ پہلے ہی ہم ۲۴۵ ارب روپے اس مد میں ادا کر رہے ہیں اور قوم پر بیرونی قرضوں کے علاوہ ۱۰۰۰ ارب روپے کے اندرونی قرضوں کا اتنا بڑا اور بھاری بوجھ بھی لدا ہوا ہے جس نے ہماری معیشت کو نڈھال کر رکھا ہے۔ باہر سے مزید قرضے نہ لیے تو نوٹ چھاپے جائیں گے جس سے افراطِ زر میں مزید اضافہ ہوگا اور مہنگائی عام آدمی کا جینا مزید حرام کر دے گی۔



اس بجٹ میں تو دفاع کے لیے بھی رقم نہیں بچتی۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ متوازن اور ٹیکس فری بجٹ پیش کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجٹ پیش ہی نہیں کیا گیا۔ بجٹ تو آمد و خرچ کے توازن اور میزانیے کا نام ہے۔ اس بجٹ کا مطلب قوم کے سامنے اقتصادی لحاظ سے ایک تاریک مستقبل ہے۔ آئی ایم ایف اور دوسرے بیرونی مالیاتی اداروں کے دباؤ کے تحت درآمدات پر تمام ڈیوٹیاں ختم یا کم کر دی گئی ہیں اور وہ سامان درآمد ہو رہا ہے جو ہماری کسی قومی ضرورت کا نہیں۔ اس سے ننانوے فیصد لوگوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ ایک فیصد مراعات یافتہ طبقے کی تعیش کی خواہشات پوری ہوتی ہوں اور اس کا سارا بوجھ ننانوے فیصد غریب عوام پر پڑتا ہے۔

جتنے قرض لیے گئے تھے وہ ضائع کر دیے گئے۔ بہت سے قرض معاف کر دیے گئے ہیں۔ ابھی سپریم کورٹ نے تفصیل پوچھی ہے کہ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء تک جو قرض معاف کیے گئے ان کی تفصیل پیش کی جائے۔ سب سے زیادہ کرپشن کا عرصہ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء تک کا ہے۔ مگر ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء تک کا عرصہ بلاوجہ احتساب کے قوانین سے مستثنیٰ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ موجودہ حکمران خود قرض معاف کرنے میں قرض ادا نہ کرنے اور پلاٹ الاٹ کرانے کے جرائم میں ملوث ہیں۔ یہ احتساب کے بارے میں بھی سنجیدہ نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی پارٹی کے ایک سینیٹر کو احتساب کا ذمے دار بنا کر عدلیہ کو اس کے ماتحت کر دیا ہے۔ ہائی کورٹ کے ایک جج نے اسے ”گسٹاپو“ کہا۔ حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ احتساب کا یہ نظام سخت ناقابل اعتبار ہے۔

پیپلز پارٹی کے خلاف جماعت اسلامی کی قیادت میں جو زبردست عوامی تحریک چلی اس تحریک کی کامیابی کے بعد جماعت نے ۹۷ کے انتخابات میں حصہ لینے سے اس لیے

انکار کر دیا تھا کہ یہ دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کے مطابق نہیں ہو رہے تھے۔ حالانکہ یہ تحریک اس بنیاد پر چلائی گئی تھی کہ گزشتہ دور کی لوٹ مار کا احتساب ہوگا اور کسی لٹیرے کے منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آنے کے امکانات ختم کر دیے جائیں گے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا کہ انتخابات میں حصہ لینے والوں کو دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کا پابند کر دیا جاتا۔ دفعہ ۶۲ میں کہا گیا ہے کہ صرف وہی شخص اسمبلی کے انتخابات کا امیدوار بن سکتا ہے جو دین کا بنیادی علم رکھتا ہو، کبار سے اجتناب کرتا ہو، فرائض ادا کرتا ہو اور لوگوں میں اچھی شہرت رکھتا ہو۔ مگر بغیر احتساب کے اور بغیر آئین کی متعلقہ دفعہ کا لحاظ رکھے انتخابات کر دیے گئے۔ چنانچہ جماعت نے واضح آئینی اور قانونی بنیادوں پر انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ ہم نے کہہ دیا تھا یہ انتخابات ہمیں کسی منزل کی جانب نہیں لے جائیں گے۔ اس کے نتیجے میں ایک اور لٹیرا گروہ برسرِ اقتدار آ جائے گا۔ انتخابات کے جو نتائج نکلے، جو لوگ اقتدار میں آئے اور انہوں نے گزشتہ عرصے میں جس کردار کا مظاہرہ کیا، اس کے بعد لوگوں نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ دونوں گروہ ایک ہی کھوٹے سکے کے دو رخ ہیں۔ لوگوں میں پیپلز پارٹی کی طرح مسلم لیگ سے بھی مایوسی پیدا ہو چکی ہے۔ انہوں نے نواز شریف سے جو کچھ امیدیں وابستہ کی تھیں وہ بھی خاک میں مل گئی ہیں۔ لوگوں نے اپنے اس ردِ عمل کا واضح طور پر اظہار بھی کرنا شروع کر دیا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے جو فوڈ ممبر سازی کے لیے عوام کے پاس جاتے ہیں، وہ واپس آ کر بتاتے ہیں کہ لوگ جماعتِ اسلامی کو اُمید کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں اور جماعتِ اسلامی نے عوام سے رابطے کا جو راستہ نکالا ہے، لوگ اس کی تحسین کر رہے ہیں۔

ممبر سازی کی اس مہم کا ہمیں دہرا فائدہ ہوا ہے۔ اس سے جہاں لوگوں کی مایوسی اُمید میں بدلنے لگی اور وہ ملک کے مستقبل کو حقیقی معنوں میں سنوارنے کے لیے جماعتِ اسلامی



کی قیادت قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کر رہے ہیں وہاں ہمارے اپنے کارکنوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ وہ متحرک ہو رہے ہیں۔ جس طرح بہتے پانی سے جراثیم مر جاتے ہیں اسی طرح اس تحریک سے بھی تساہل اور کاہلی کے اثرات ختم ہو گئے ہیں۔ ہمارے کارکن خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے راستے میں نکلے ہیں۔ مساجد میں ذکر کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ اپنی تربیت ہوتی ہے۔ اعمال سنوارنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت بڑے پیمانے پر لوگوں کے ساتھ ساتھ رابطہ ہوا ہے اور بڑے پیمانے پر پذیرائی ملی ہے۔ عام طور پر ایک سو ملاقاتوں میں سے ۸۰ افراد ممبر بن جاتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں نصف لوگ ممبر بن جاتے ہیں۔ اب تک جہاں سے کم سے کم ممبر بننے کا رجحان سامنے آیا ہے وہ بھی ۲۵، ۳۰ فیصد کی نسبت ہے۔ اچھی بات تو یہ ہے کہ ممبر نہ بننے والے لوگ بھی مخالفت نہیں کرتے، تاہم مختلف وجوہ بیان کر کے ممبر بننے سے معذرت کرتے ہیں۔ جماعت کے کارکنوں کو اس سے زبردست حوصلہ ملا ہے۔ اب تک کے اعداد و شمار کے مطابق ملک میں بارہ لاکھ افراد ممبر بن چکے ہیں اور ستمبر کے اواخر تک ہمارا اندازہ ہے کہ ان شاء اللہ پچاس لاکھ ممبر بنانے کا ہدف پورا کر لیا جائے گا۔

پچاس لاکھ ممبر بن جائیں گے تو ان شاء اللہ منظر بالکل تبدیل ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم تنظیم کا کام بھی کر رہے ہیں۔ ہمارے کارکن جہاں بھی جاتے ہیں، گلی محلے اور یونین کونسل کے ہر وارڈ کی سطح تک جماعت اسلامی کی رابطہ کمیٹی بنا دیتے ہیں۔ اس رابطہ کمیٹی میں صدر، نائب صدر، جنرل سیکرٹری، جوائنٹ سیکرٹری، ناظم بیت المال اور دوسرے پانچ چھ افراد پر مشتمل مجلس عاملہ قائم ہو جاتی ہے۔ یہ دس پندرہ آدمیوں پر مشتمل رابطہ کمیٹی مل کر کام کرنے والی ایک ٹیم بن جاتی ہے۔ یہ یونٹ تقریباً ایک سے دو ہزار آبادی کی نمائندگی کرے گا۔ ان شاء اللہ یہ وہاں مختلف شعبوں میں اقدام پیشہ اور Initiative لینے والے



ہوں گے۔ یہ کمزور، غریب اور ضرورتمند عوام کے مسائل حل کریں گے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوں گے۔ ظلم کے خلاف، غنڈہ گردی کے خلاف یہ عوام کو منظم کریں گے۔ جہاں وسائل ملیں گے، وہاں کوئی تعلیمی ادارہ اور خدمتِ خلق کا کوئی ادارہ قائم کر دیں گے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آبادی کے اندر بہت گہرائی تک ہمارا پیغام اور دعوت پہنچے گی۔ اس پورے عمل کے نتیجے میں ان شاء اللہ ایک بڑی تبدیلی، ایک زبردست انقلاب کا آغاز ہوگا۔ ہم نے اپنے کارکنوں سے کہا ہے کہ جہاں بھی رابطہ کمیٹی قائم ہو، وہاں ایک دفتر بھی قائم کر دیں۔ اس دفتر پر جماعت کا تین رنگوں والا بورڈ لگا کر اس پر لکھ دیں۔ ”جماعتِ اسلامی رابطہ کمیٹی“ فلاں وارڈ یا محلہ وغیرہ۔ اس پر جماعتِ اسلامی کا جھنڈا لگا دیں۔ اس سے ان شاء اللہ پورے ملک میں یہ تاثر بھی ختم ہو جائے گا کہ جماعتِ اسلامی مخصوص لوگوں کی چھوٹی سی جماعت ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف پہلے ہی لوگ کر رہے ہیں کہ جماعتِ اسلامی دیا نندار اور بے لوث افراد کی منظم ترین جماعت ہے اور یہ کرپشن کو مٹا سکتی ہے، وہاں یہ بات بھی چند ماہ کے اندر اندر انشاء اللہ مسلمہ حقیقت بن جائے گی کہ جماعتِ اسلامی ملک کی سب سے بڑی عوامی تحریک ہے۔ یہ انقلاب لانے کی صلاحیت کی حامل ہے اور اس کے پاس ہر شعبے میں انقلاب لانے کے لیے افرادی قوت اور اہلیت موجود ہے۔ یہ جو پھبتی کسی جاتی ہے کہ ”ملا“ آجائیں گے اور ملا کا انقلاب آجائے گا تو ہم یہ واضح کر دیں کہ جماعتِ اسلامی کسی خاص طبقے کی جماعت نہیں، اس میں ہر مسلک، نسل اور زبان کے لوگ ہیں۔ البتہ اس میں انتہا پسند لوگ شامل نہیں۔ اس میں ہر پیشے اور شعبے کے دین کا درد رکھنے والے لوگ ہیں۔ مزید اچھے لوگ شامل ہو رہے ہیں۔ ان شاء اللہ ہم اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کی بنیاد پر ایک حقیقی انقلاب کی داغ بیل ڈالنے کی تیاری کے مرحلے میں ہیں۔

پچاس برسوں میں جہاں استعماری ایجنٹوں نے مختلف ناموں سے اقتدار میں رہ کر

ملک کو تباہی کے گڑھے کے کنارے لاکھڑا کیا، وہاں قوم کے اندر خیر کی قوتوں کی شکل میں ایک متوازی احساس موجود رہا ہے اور وہ اب ایک قوت اور ایک حیات بخش انقلاب کی شکل میں نمودار ہونے والا ہے۔ جماعت اسلامی ایک ہمہ گیر اسلامی تحریک کی شکل میں انقلاب کا پیغام لے کر ابھری ہے جو قوم کو علاقائی، نسلی اور لسانی اختلافات سے بالاتر ہو کر اسلامی نظریے کی بنیاد پر اکٹھا کرے گی، ایک لڑی میں پروئے گی اور سارے انسانوں کے لیے ایک عادلانہ نظام قائم کرے گی تاکہ ملت اسلامیہ پاکستان ان مقاصد کو حاصل کر سکے جن کے لیے یہ ملک قائم ہوا تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ آخرت میں کامیاب ہو سکے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں جماعت اسلامی ”سول فلاحیٹ“ چلا رہی ہے۔ یہ سول فلاحیٹ نہیں، یہ تو پوری قوم کو متحد کرنے کی جدوجہد ہے۔ ایک ہمہ گیر دعوت ہے۔ بہت سی جماعتوں کا اتحاد بنا کر کام کرنے کا طریقہ ناکام ہو چکا ہے اس لیے کہ مختلف جماعتوں میں بالعموم نظریے یا طریقہ کار کا اختلاف ہوتا ہے یا ان میں شخصیات کا ٹکڑاؤ ہوتا ہے۔ اگر اختلافات کی یہ شکلیں موجود ہوں اور آپ ایسے لوگوں کو یکجا کر بھی دیں تو وہ کسی بڑے چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اکثر ایسے لوگ عین وقت پر منتشر ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کو بالکل یکسو قیادت میسر نہیں آ سکتی اور مزید مایوسی پھیلتی ہے۔ حال ہی میں بارہ جماعتوں کو سیکولر بنیادوں پر اکٹھا کرنے کی ایک کوشش کی گئی مگر عوام میں اس اتحاد کو پذیرائی نہیں ملی، اس لیے کہ ان میں سے اکثر جماعتوں اور لیڈروں کے نام بھی لوگوں کو معلوم نہیں۔ اسی طرح ایک جگہ کھانے پر کچھ جماعتوں کی رہنما اکٹھے ہوئے وہاں بھی اتحاد بنانے کی بات ہوئی، مگر اکثر شرکاء نے وہیں پر اس سے اختلاف کیا۔ اس قسم کے اتحاد لوگوں کے اندر کسی قسم کی اُمید پیدا کرنے کا باعث نہیں بن پاتے جبکہ جماعت اسلامی کو بڑے پیمانے پر اُمید بھری نظروں سے دیکھا جا رہا ہے، اس لیے کہ لوگوں کو اس کی شکل میں درست سمت میں رہنمائی اور یکسو قیادت مل رہی ہے۔



الحمد للہ قافلہ منظم ہو چکا ہے، اُمید کی روشنی پھیل رہی ہے۔ اس مرحلے پر میں ایک خدشے کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہا جاتا ہے جس الجزائر میں غیر ملکی طاغوتی طاقتوں نے اسلامی تحریک کے برسرِ اقتدار آنے کو برداشت نہیں کیا اور قوت کے بل بوتے پر اسلامی فرنٹ (FIS) کو دبانے کی کوشش کی تو کیا یہاں پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا؟ ہمارے خیال میں اگر اس ضمن میں دینی قوتوں کے خلاف فوج کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی تو فوج کی یکسوئی بری طرح متاثر ہوگی۔ فوج میں بہت بڑی تعداد میں دینی اور اسلامی عناصر موجود ہیں جو عوام کی پرامن اور جمہوری طریقے سے اُٹھائی گئی تحریک کو کچلنے سے عمل سے متاثر ہوں گے۔ مجھے یقین ہے فوجی قیادت فوج کے مضبوط اور متحد ادارے کی یکسوئی متاثر کرنے کی غلطی نہیں کرے گی۔ ملک میں واحد مضبوط ادارے کے اتحاد کو داؤ پر لگانا ملک دشمنی ہوگی۔ فوج خود عوامی قوت کے خلاف کھڑا ہونا قبول نہیں کرے گی لیکن شرط یہ ہے کہ عوام (Masses) پوری طرح تحریک کا ساتھ دیں اور پرامن رہیں۔

ایک خدشہ یہ بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ملک کا نظام تباہی سے دوچار ہے، آواز بگڑا ہوا ہے، امن و امان کی حالت خراب ہے، رشوت اور کرپشن، ملک کی دولت کو لوٹا گیا ہے۔ کیا جماعت اسلامی اس خرابی کی اصلاح کر پائے گی اور اگر کوئی تبدیلی آ بھی گئی تو کیا جماعت عوام کی توقعات پر پورا اُتر سکے گی؟ ہم سمجھتے ہیں اگر ایک اچھی اور بے لوث قیادت ملک کو میسر آ جائے جس کی پشت پر ایک منظم تحریک ہو جس کے مخلص اور دیانتدار کارکن ملک کی ہر بستی اور ہر گلی کوچے میں موجود ہوں اور وہ یہ تہیہ کر لیں کہ ہم عدل و انصاف کے لیے کام کریں گے، معاشرے کی تطہیر کے لیے جان لڑا دیں گے، اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کریں گے تو یہ عین ممکن ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مراعات یافتہ طبقے نے ”ایلیٹ کلچر“ بنا رکھا ہے جو عوام سے بالاتر رہتے اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند رکھتے ہیں اور جو



اپنے لیے پچاس ہزار اور ایک لاکھ روپے ماہانہ آمدنی کو بھی کم سمجھتے اور غریب طبقے کے لیے دو چار ہزار روپے کو بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ ان شاء اللہ ہم اس طرح کے کلچر کو ختم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور اسے ختم کریں گے۔ ہمارے تمام کارکن متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ حکومت میں جا کر حکومتی خزانے پر بوجھ نہیں بنیں گے بلکہ قومی خزانے کو غریب عوام کے لیے وقف کر دیں گے۔ قیادت پہلے ہی مرحلے پر عوام کو یقین دلادے گی کہ وہ ان میں سے ہے۔ کوئی بھی صدر یا وزیر اعظم کے محل کو استعمال نہیں کرے گا۔ گزشتہ بجٹ میں صرف ان دو گھروں کا خرچ ۷۲ کروڑ تھا۔ ہم نے بار بار کہا ہے کہ سرکاری فرائض اپنے سیکرٹریٹ میں ادا کر سکتے ہیں اپنی ذاتی زندگی عوام کی سطح پر گزاریں۔

ہمارے خیال میں حاکم بڑے افسر اور ایک عام شخص کے لیے یکساں اصول زندگی ہونا چاہیے کہ اس کے پاس ایسا مکان ہو جس کی دیکھ بھال اس کے گھر کے افراد خود کر سکیں۔ اس کی بیوی خود کھانا پکائے۔ اس کے گھر میں افراد خانہ سے زیادہ تعداد نوکروں کی نہ ہو بلکہ گھر کے افراد خود مل کر کام کریں۔ الحمد للہ ہم پہلے ہی ایسی زندگی گزار رہے ہیں اور یہ معیار زندگی ہر جگہ اپنا سکتے ہیں۔ ہمارے کارکنوں کی بھی یہی تربیت ہے اور ہمارے بچوں کو بھی یہی سکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی طرز عمل کو ہم اپنے اور اپنی اولاد کے لیے مضر اور مخرّب اخلاق سمجھتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے بعض افراد کے پاس اس وقت بھی وسائل موجود ہیں لیکن انھوں نے اپنا کلچر تبدیل نہیں کیا۔ اگر جماعت کے لوگوں کے پاس اختیارات آگئے تو وہ اس سے بھی کم تر معیار زندگی اپنانے پر بخوشی رضا مند ہو جائیں گے۔ یہ پوری طرح اس بات پر آمادہ ہیں کہ انھیں ملک و قوم کو تباہی کے گڑھے سے نکالنے اور بچانے کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کرنا ہے چاہے کیسی ہی قربانی قربانی دینی پڑے۔ ہم جو انقلاب لانا چاہتے ہیں اس میں پوری قوم کو جہادی سپرٹ اور شہادت کے جذبے سے

شریک کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پوری پاکستانی قوم کو اس بات کے لیے تیار کر رہے ہیں کہ اپنی آزادی کے لیے ہر قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اقبال نے کہا ہے ع  
مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ  
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

مسلمان قوم کی قوت کا راز اس بات میں پنہاں ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں مرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہے۔ اس بات کو قرآن پاک میں بیان کیا گیا:

قُلْ إِنْ صَلَوَتِي وَنَسْكَی وَمَعِیَای وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (الانعام ۶: ۱۶۲)  
”کہو میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنے سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔“

جو موت کے سرمائے کو اللہ کے لیے وقف کر دیتا ہے، صحیح معنوں میں آزادی کا لطف بھی وہی اٹھا سکتا ہے۔

جماعت اسلامی اس تمدن کو بدل کر شرافت، پاک بازی اور جہاد کا کلچر لانا چاہتی ہے۔ موجودہ تمدن جس میں بے حیائی اور فحاشی کو فروغ مل رہا ہے، یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس نے معاشرے کو فساد اور مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ جب جہاد کا کلچر پھیلے گا تو ہماری پوری نوجوان نسل کم تر اور گھٹیا مشاغل چھوڑ کر اعلیٰ مقاصد اور ارفع نصب العین کے لیے جینا شروع کر دے گی۔ جماعت اسلامی گزشتہ پچاس برس سے اس نظام کے لیے تیاری کرتی آئی ہے۔ ہم سود سے پاک معیشت کا نظام لانے کے لیے پوری طرح تیاری (Home work) کر چکے ہیں۔ ہم ملک کو ایک جامع نظامِ تعلیم دیں گے۔ ہم نوجوان نسل کے لیے صحتمند تفریح اور دلچسپ مشاغل کا ایک پیکیج دیں گے جس سے ان کی صلاحیتوں کو نکھار ملے گا اور وہ معاشرے کے لیے مفید شہری بنیں گے۔ ان شاء اللہ ہم اپنی فوج کو

مضبوط تر بنائیں گے اس کی دفاعی صلاحیت میں اضافہ کر کے اسے ناقابلِ تسخیر بنا ڈالیں گے۔ اگر کسی کے دل میں یہ وہم ہے کہ امریکہ ہمیں اسلحے کی ترسیل روک دے گا تو اب اسلحہ فروخت کرنے والے لوگوں میں مسابقت ہے ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ امریکہ کی بات روس سنتا ہے نہ فرانس اور نہ جرمنی۔ ہم جہاں سے چاہیں اسلحہ حاصل کریں گے۔

جماعت اسلامی کو دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے مقابلے میں اپنے کارکنوں کی تربیت اور تنظیم کا زیادہ موقع ملا ہے۔ اس کے کارکن ایسی بڑی طاقت ہیں کہ جو حالات تبدیل کر سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ چند ماہ کے دوران میں یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ہمارے یہ کارکن پورے منظر کو بد کرنے کی کیسی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے اپنے تمام بھی خواہوں کے مشورے کے ساتھ ملک کے لیے ایک بہتر لائحہ عمل طے کریں گے۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ سے باہر بھی پوری دنیا میں جماعت اسلامی کے پروگرام اور دعوت سے محبت رکھنے والے اہل الرائے لوگ ہیں۔ ملک کے لیے نئے نظام کی تشکیل میں ان سب حضرات کے مشورے سے بھی فائدہ اٹھایا جائے گا ان شاء اللہ۔

اس طرح ہم ملک کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ان شاء اللہ اپنی قوم کو مایوسیوں کے عمیق غار کے دہانے سے نکال کر روشن مستقبل کی واضح نشاندہی کریں گے اور انھیں آزادی کے حقیقی معنی سے آشنا کر کے اس کے ثمرات سمیٹنے کے لیے آمادہ کریں گے۔ اگر ہم اللہ کی توفیق سے اس میں کامیاب ہو سکے تو پچاسویں سالگرہ کے موقع پر قوم کے لیے اور آئندہ نسلوں کے لیے یہ ایک بہترین تحفہ ہوگا۔

(اگست ۱۹۹۷ء)